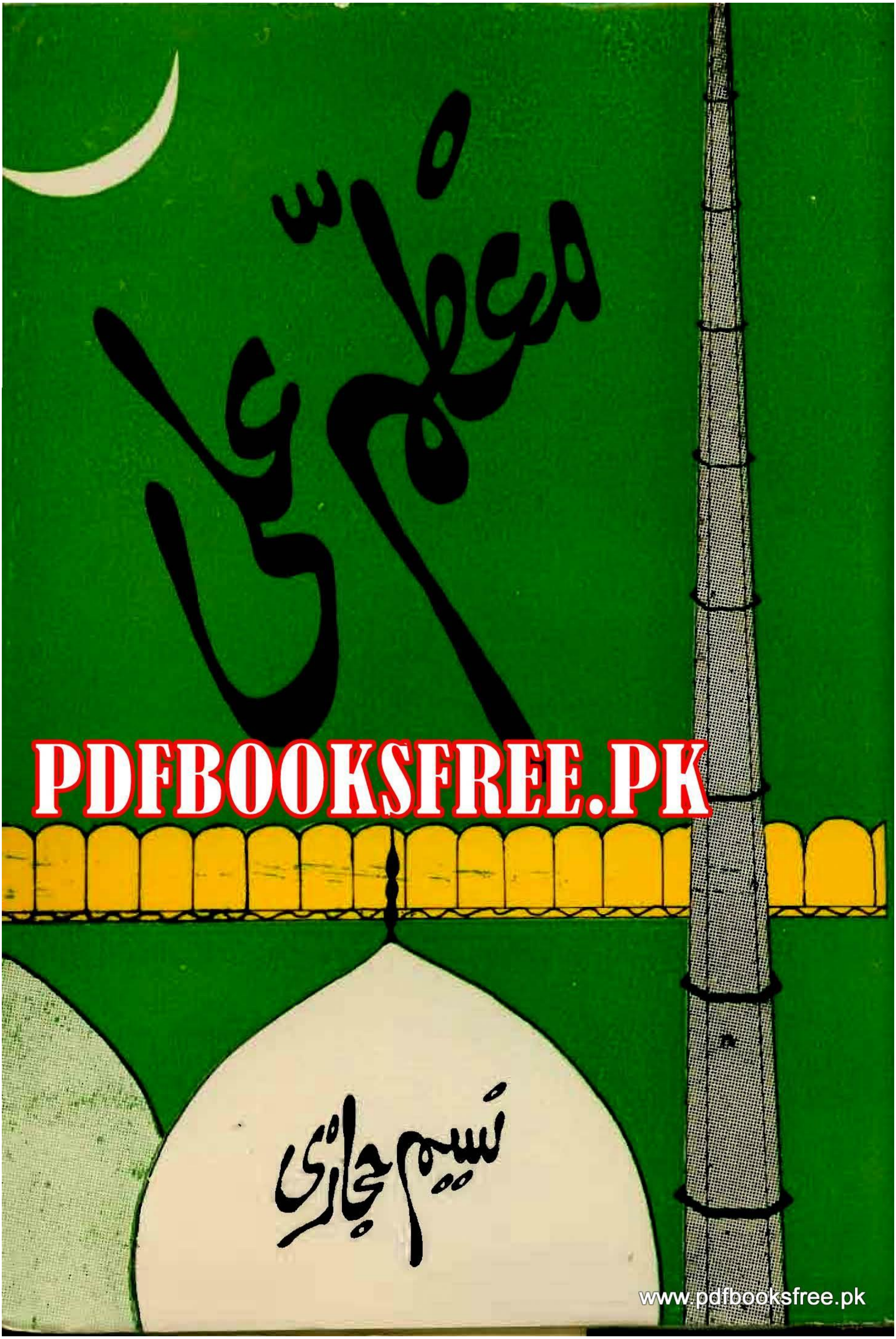

معظم علی

نسیم حجازی

مُعظّم علی

نسیم حجازی

☆

فرحین پبلیشنگ کمپنی ح F کھجوری روڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

نام کتاب ——— معظم علی
مصنف ——— نسیم حجازی
ناشر ——— فرحین پبلیشنگ کمپنی
3 F کھجوری روڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
تعداد ——— ایک ہزار
مطبع ——— فرح آفسیٹ پرنٹرس دہلی
سالِ اشاعت ——— فروری سنہ ۱۹۹۶ء
قیمت ——— ساٹھ روپے /=60 .Rs

فرحین پبلیشنگ کمپنی 3 F کھجوری روڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

سول ایجنٹ
ادبی دنیا ۵۱۰ مٹیا محل دہلی ۱۱۰۰۰۶

پہلا باب

معظم علی مُرشدآباد کے قیدخانے کی ایک کوٹھری میں پڑا ہُوا تھا۔ اس کے ماضی کی داستان اُن اُمیدوں، آرزوں، حوصلوں اور ولولوں کی داستان تھی جو پلاسی کے میدان میں سراج الدّولہ کی شکست کے ساتھ دم توڑ چکے تھے۔ زندگی کے دامن میں اب اُس کے لیے مہیب تاریکیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ پہلے بھی مُرشدآباد سے کوسوں دُور ایک قیدخانے میں رہ چکا تھا۔ لیکن وہاں اپنی تاریک کوٹھری میں وہ اس مُرشدآباد کا تصور کر سکتا تھا جس کا ہر گوشہ قوسِ قزح کی انگینیوں سے لبریز تھا۔ حال کی تلخیاں اُسے مستقبل کی مسرتوں کا پیغام دے سکتی تھیں۔ اسیری کی رات کے تاریک پردے اُٹھا کر وہ صبحِ آزادی کے آفتاب کی سُنہری کرنیں دیکھ سکتا تھا۔ اڑلیسہ کی سرحد کے پار وہ قیدخانہ [illegible] کے راستے کی ایک منزل تھی اور اسے یقین تھا کہ کسی دن وہ اس منزل سے گزر کر وہ پھر اس دنیا میں پہنچ جائے گا، جہاں زندگی کی مسکراہٹیں اس کے استقبال کے لیے موجو[illegible] لیکن مرشدآباد میں اس کی اسیری کا زمانہ ان ستاروں کی جھلملاہٹ سے محروم تھا جو تاریک رات کے مسافروں کو صبح کا پیغام دیتے ہیں۔

کوٹھری کی دیوار میں چھت کے قریب ایک چھوٹا سا روزن تھا اور قید کے ابتدائی ایّام میں اس روزن سے سُورج کی شعاعیں اسے دنیا کا پیغام دیا کرتی تھیں جہاں ابھی تک اُمید کا ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ وہ تصور میں اپنے ماحول کی بھیانک تاریکیوں سے نکل کر اس مکان

کی چار دیواری میں جا پہنچتا جو اُس کی موہوم اُمیدوں کی آخری جائے پناہ تھا۔ وہ اُن کمروں کا طواف کرتا جہاں کبھی مسرّت کے قہقہے گونجتے تھے۔ اچانک فرحت مکان کے کسی گوشے سے نمودار ہوتی اور وہ کہتا "فرحت! فرحت!! میں آگیا ہوں۔ میں زندہ ہوں، میں تمھارے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ قید خانے کی تنہائیوں میں تم ہر وقت میرے ساتھ تھیں۔ میرے سپنے اور آرزوئیں سب تمھارے لیے تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم کہیں جا چکی ہو اور میں تمام عمر تمھیں تلاش کرتا رہوں گا۔ کاش! قید خانے میں مجھے تمھارا کوئی پیغام مل سکتا۔ فرحت! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم مرشد آباد سے کہیں دور نکل جائیں گے اور اپنے لیے ایک نئی دنیا آباد کریں گے۔ تمھارے ساتھ رہ کر میں کبھی یہ محسوس نہیں کروں گا کہ میں کاروانِ حیات کا ایک لٹا ہوا مسافر ہوں"

پھر اس کی کوٹھڑی میں اور قیدی آئے اور انھوں نے بتایا کہ فرحت اور اس کے والدین تمھاری گرفتاری کے اگلے دن مرشد آباد سے ہجرت کر گئے تھے۔

اس کے بعد معظم علی کو مستقبل کے متعلق موہوم اُمیدیں مایوسیوں سے زیادہ کرب انگیز محسوس ہوتی تھیں۔ وہ فرحت کو ان دیکھے صحراؤں، جنگلوں اور پہاڑوں میں تلاش کیا کرتا تھا۔ کبھی وہ اسے کسی دور افتادہ بستی کی جھونپڑی میں دیکھتا اور کبھی وہ اسے کسی پُررونق شہر کے محل میں نظر آتی تھی۔ پھر اُس شہابِ ثاقب کی طرح جو ایک ثانیہ کے لیے تاریک فضا میں نور کے خزانے بکھیرنے کے بعد روپوش ہو جاتا ہے۔ فرحت کی دلکش تصویریں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں اور وہ حال اور مستقبل کے بھیانک خلاء سے نکل کر ماضی کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کرتا۔ کبھی تصوّر اسے اس مکان میں لے جاتا جہاں اس نے زندگی کی ابتدائی مسکراہٹیں دیکھی تھیں۔ کبھی وہ اس محلّے کی گلیوں میں گھومتا جہاں وہ اپنے بچپن کے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ سنِ شعور سے لے کر قید خانے میں پہنچنے تک کی زندگی اسے ایک خواب معلوم ہوتی تھی — ایک ایسا خواب جو دلکش بھی تھا اور بھیانک بھی ؞

معظم علی اُس قوم کا فرد تھا جو صدیوں تک اس ملک میں اپنی سطوت و اقبال کے پرچم لہرانے کے بعد زوال کے آخری مرحلوں میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے اس وقت آنکھ کھولی تھی جب مغلوں کی عظیم الشان سلطنت لامرکزیت اور انتشار کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد چند سال کے اندر اندر ہندوستان کا وہ دفاعی حصار پیوندِ زمین ہو چکا تھا جسے تیمور کے جانشینوں نے تعمیر کیا تھا۔ دلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے لیے حریص قسمت آزماؤں کے لشکر موجود تھے۔ ملک کی سیاست ہر ضابطۂ اخلاق سے آزاد تھی۔ نام نہاد بادشاہ اپنے وزیروں، اہلکاروں اور بعض اوقات خواجہ سراؤں کے ہاتھ میں شطرنج کے مہرے تھے۔ طالع آزماؤں کی تلواریں کبھی تاج پہننے والوں کے سر قلم کرتی تھیں اور کبھی تاج پہنانے والوں کے خون میں نہاتی تھیں۔ اقتدار کی مسند تک پہنچنے کے لیے ایک قسمت آزما کی لاش دوسرے قسمت آزما کے لیے زینے کا کام دیتی تھی، عہد شکنی، عیاری، فریب، سازش اور قتل۔ لال قلعے کی دیواروں میں جنم لینے والی داستانوں کے مستقل عنوان بن چکے تھے۔ لال قلعہ سے باہر ہر صوبیدار اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے کی فکر میں تھا۔

مرکز اور صوبوں میں علاقی سیاست کا یہ دَور المناک بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ بادشاہ سلامت کبھی کسی امیر کی تلوار سے مرعوب ہو کر اور کبھی اس کی خوشامد سے خوش ہو کر اسے کسی علاقے کی صوبیداری کی سند عطا فرماتے۔ وہ صوبائی دارالحکومت کی طرف روانہ ہوتا تو اسے راستے میں یہ خبر ملتی کہ شہنشاہِ والا تبار نے اپنا پہلا حکم نامہ منسوخ فرما کر کسی اور کو صوبیداری کی سند عطا کر دی ہے اور وہ بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت صوبائی دارالحکومت کا رُخ کر رہا ہے۔

پھر صوبے کے اُمراء کا ایک گروہ پہلے امیدوار کے ساتھ اور ایک دوسرا گروہ دوسرے اُمیدوار کے ساتھ مل جاتا۔ دونوں میں جنگ ہوتی — ہارنے والا اُمیدوار اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور اس کا خون جیتنے والے کی سند پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دیتا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ صوبیداری کا ایک اُمیدوار شاہی فرمان کے عوض ایک معقول رقم پیش کرتا اور دوسرا امیدوار اس سے زیادہ

رقم دے کر اپنے لیے ایک اور فرمان حاصل کر لیتا۔

۱۷۲۵ء میں سلطنتِ دہلی کے ایک ہوشیار وزیر نظام الملک آصف جاہ نے اپنی شاطرانہ چالوں کی بدولت دکن میں مضبوطی سے قدم جما لیے۔ وہ بظاہر دلی کے نام نہاد بادشاہ کا صوبیدار تھا لیکن عملاً دکن کے سیاہ و سفید کا مالک بن چکا تھا۔ ۱۷۴۸ء میں نظام الملک کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے۔

نظام الملک آصف جاہِ اوّل کے اسلاف، سلطنت خوارزم پر تاتاریوں کے حملوں کے زمانہ میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ اسی طرح ایک اور خاندان ترکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں اسی خاندان کا ایک فرد محمد جانِ جہاں انورالدین حکومت کا ادنیٰ ملازم تھا۔ لیکن اورنگ زیب کی موت کے بعد جب ہر قسمت آزما کے لیے ترقی کے راستے کھلے تھے۔ یہی جانِ جہاں، خانِ جہاں بن گیا اور کرناٹک کی نظامت پر فائز ہوا۔ ۱۷۴۹ء میں انورالدین خانِ جہاں نے وفات پائی اور کرناٹک کی حکومت اُس کے بیٹے محمد علی والا جاہ کے ہاتھ میں آئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال اور جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں پر فرنگی تاجروں کی بستیاں اسلحہ خانوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ ایک طویل کشمکش کے بعد انگریز اور فرانسیسی تاجر اپنے پرتگالی اور ولندیزی حریفوں کو مات دے چکے تھے اور اب وہ ہندوستان کی تجارتی منڈیاں تلاش کرنے کی بجائے اس ملک کے سیاسی اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ انھوں نے ملک کے اندرونی خلفشار سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جب کسی صوبہ میں حکومت کے دو دعوے داروں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو ایک فریق انگریزوں کی حمایت حاصل کرتا اور دوسرا فریق اپنا مستقبل فرانسیسیوں کے ساتھ وابستہ کر دیتا۔

دکن میں نظام الملک آصف جاہِ اوّل کے جانشین کبھی انگریزوں اور کبھی فرانسیسیوں کے ہاتھ میں کھیلتے رہے۔ کرناٹک میں محمد علی والا جاہ انگریزوں کی بساطِ سیاست کا ایک مہرہ تھا

اور فرانسیسی، کرناٹک کی حکومت کے ایک اور دعوے دار چندا صاحب کے طرف دار بن گئے تھے۔ چندا صاحب نے کرناٹک کے بیشتر حصوں پر قبضہ کر کے محمد علی کو ترچناپلی میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ چند سال تک محمد علی ایک ایسا حکمران تھا جس کے قبضے میں کوئی ملک نہ تھا اور جس کی رعایا زیادہ تر اپنے خاندان کے افراد، چند نوکروں، جی حضوریوں اور خوشامدیوں تک محدود تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ انگریزوں کی سنگینوں کے پہرے میں باقاعدہ دربار لگاتا تھا۔ اس کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے تھے اور اسے نواب والا جاہ، امیر الہند، عمدۃ الملک، آصف الدولہ محمد علی خاں، بہادر ظفر جنگ، سپہ سالار، صاحب السیف والقلم، مدبر امرائے عالم، فرزند عزیز از جان کے القاب و خطابات سے پکارا جاتا تھا۔ جب انگریز، فرانسیسیوں سے کرناٹک کا کوئی علاقہ فتح کرتے تو یہ سپہ سالار اپنی حرم سرائے میں جشن مناتا اور جب انھیں اپنی افواج کو تنخواہ دینے کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی تو اس مدبر امرائے عالم کو مفلوک الحال عوام سے ٹیکس وصول کرنے کے کام پر لگا دیا جاتا۔

پہلے چندا صاحب نے فرانسیسیوں کی خدمات کے صلے میں کرناٹک کے بعض علاقے ان کے حوالے کر دیئے۔ پھر جب محمد علی کی باری آئی تو اس نے انگریزوں کو عملاً کرناٹک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ بظاہر کرناٹک محمد علی کی شکارگاہ تھا لیکن شکار کھیلنے والے انگریز تھے۔

دلی کے تخت کے ساتھ نوابانِ اودھ کا تعلق بھی برائے نام تھا۔ ۱۷۴۰ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی حکومت پر علی وردی خاں نے قبضہ جما لیا۔ اس زمانے میں جنوبی ہند کی طرح بنگال میں بھی انگریز تاجر اپنے قدم جما چکے تھے۔ لیکن علی وردی خاں ایک بیدار مغز اور دور اندیش حکمران تھا۔ اور اس نے فرنگی تاجروں کو جو مراعات دیں ان کی ایک اہم شرط یہ تھی کہ وہ اپنی تجارتی بستیوں میں قلعے یا دفاعی چوکیاں تعمیر نہیں کریں گے۔

اس زمانے میں ہندوستان کی ایک اور بڑی طاقت مرہٹے تھے جو مغلیہ سلطنت کے کھنڈروں پر اپنی سلطنت کی بنیادیں استوار کرنے کی فکر میں تھے ÷

معظم علی نے اس وقت آنکھ کھولی تھی جب ہندوستان مرہٹہ لٹیروں کے لیے ایک وسیع شکارگاہ بن چکا تھا۔ اس کا باپ محمود علی، علی وردی خان کی محافظ فوج میں پانچ سو سواروں کا سالار تھا۔ مُرشد آباد کے شہر سے باہر ایک نئے محلے میں محمود علی کے مکان کے سامنے ایک بہت بڑے جاگیردار مرزا حسین بیگ کا قلعہ نما محل تھا۔ جس کی چاردیواری کے اندر رہائشی مکان کے علاوہ گھوڑوں کے اصطبل اور نوکروں اور پہرے داروں کے کمرے تھے۔ معظم علی کا باپ ایک فوجی افسر ہونے کے باوجود مرزا حسین بیگ کے مقابلے میں ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ ابتدا میں ان کے تعلقات محض رسمی تھے۔ لیکن ان کے بیٹوں کی دوستی آہستہ آہستہ انھیں بھی ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ حسین بیگ کا چھوٹا بیٹا افضل بیگ، معظم علی سے دو سال بڑا تھا۔ اور بڑا جس کا نام آصف بیگ تھا، معظم علی کے بڑے بھائی یوسف علی کا ہم عمر تھا۔ بچپن میں یوسف اور معظم محلے کے دوسرے بچوں کی طرح حویلی میں چلے جاتے اور دن بھر آصف بیگ اور افضل کے ساتھ کھیلتے رہتے۔

حویلی میں ایک سُنہری بالوں والی کم سن لڑکی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی، اور معظم علی کو اس کے معصوم قہقہے بہت پسند تھے۔ یہ لڑکی افضل کی چھوٹی بہن تھی اور اس کا نام فرحت تھا۔

محمود علی اور اس کی بیوی کو حسین بیگ کے خاندان کے مقابلے میں اپنی کمتری کا احساس تھا، تاہم انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ ان کے بچے کسی کے مقابلے میں حقیر سمجھے جائیں۔ چنانچہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ ان کے بچوں کا لباس اگر حسین بیگ کے بچوں کی طرح قیمتی نہ ہو تو کم از کم صاف ستھرا ضرور ہو۔ پھر جب آصف اور افضل مُرشد آباد کے بہترین مکتب میں داخل ہوئے تو محمود علی نے یوسف اور معظم کو بھی اسی مکتب میں داخل کر دیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ افضل اور آصف بگھی پر سوار ہو کر جاتے تھے اور یوسف اور معظم کو پیدل جانا پڑتا تھا۔ پھر جب یہ بچے آپس میں بہت

زیادہ گھل مل گئے تو آصف اور افضل اصرار کر کے معظم اور اس کے بھائی کو اپنی بگھی پر بٹھا لیتے۔ گھر پر حسین بیگ کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک معقول تنخواہ پانے والا اتالیق مقرر تھا اور معظم اور یوسف کا باپ فرصت کے اوقات میں خود ہی انھیں پڑھا دیا کرتا تھا۔

امرا کے بچوں کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت بھی ضروری خیال کی جاتی تھی۔ چنانچہ جب آصف اور افضل ذرا بڑے ہوئے تو حسین بیگ نے ان کی فوجی تربیت کے لیے ایک تجربہ کار فوجی افسر کی خدمات حاصل کر لیں۔ وہ انھیں شہسواری، تیر اندازی اور نیزہ بازی سکھایا کرتا تھا۔ لیکن محمود علی نے اس کام کے لیے کسی اور کی خدمات کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مُرشد آباد میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو گھوڑے کی سواری اور تلوار، نیزہ اور بندوق کے کھیلوں میں اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔

اس کے گھر میں ایرانی قالین نہ تھے لیکن اس کے اصطبل میں عربی نسل کے تین چار گھوڑے ضرور موجود رہتے تھے۔ سونے چاندی کے برتنوں کی بجائے وہ اپنے ذاتی اسلحہ خانے کی بہترین تلواروں اور بندوقوں پر فخر کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی مصروف زندگی سے بچوں کے لیے تھوڑا بہت وقت نکالتا اور انھیں گھوڑوں پر سوار کرا کے شہر سے باہر کسی کھلے میدان میں لے جاتا۔

* * *

مرزا حسین بیگ کے کتب خانہ میں سینکڑوں کتابیں تھیں اور یہ کتابیں اس نے پڑھنے کا شوق پورا کرنے سے زیادہ اپنے دوستوں کو دکھانے کے لیے جمع کر رکھی تھیں۔ معظم کو پڑھنے کا شوق تھا اور وہ کبھی کبھی افضل بیگ سے کتابیں مانگ لایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ اُس کے گھر گیا تو افضل اور آصف دیوان خانے کے باہر ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے اپنے عمر رسیدہ اتالیق سے سبق لے رہے تھے۔ ان کی توجہ کتابوں کی طرف تھی۔ معظم علی کچھ دیر تذبذب کی حالت میں چند قدم دور کھڑا رہا۔ اچانک اتالیق نے اس کی طرف دیکھا اور کہا "بھئی تم کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ کھیلنے کا وقت نہیں یہ پڑھ رہے ہیں۔ بھاگ جاؤ!"

یہ بات معظم علی کے لیے غیر متوقع تھی اور وہ چند ثانیے یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ افضل بیگ نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے اتالیق سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہ کتابیں لینے آیا ہے مجھے اجازت دیجیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اتالیق جس قدر کھیلنے والے لڑکوں کو ناپسند کرتا تھا اسی قدر اسے پڑھنے والوں سے دلچسپی تھی۔ اُس نے دوبارہ معظم کی طرف دیکھا اور افضل سے کہا۔ "اچھا جاؤ لیکن جلدی آنا!"

افضل بیگ اُٹھ کر معظم علی کے ساتھ چل دیا۔ دیوان خانے کے چند کمروں کے طویل برآمدے سے گزرنے کے بعد وہ کونے کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے جس کا ایک دروازہ رہائشی مکان کے صحن کی طرف کھلتا تھا۔ کمرے میں ساگوان کی خوبصورت الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ افضل بیگ نے کہا۔ "تم اطمینان سے اپنے لیے کتابیں نکال لو میں استاد کے پاس جاتا ہوں۔"

افضل بیگ بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ معظم علی اس کمرے میں کئی بار پہلے بھی آچکا تھا۔ اسے اپنے مطلب کی کتابیں نکالنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ دو عربی اور تین فارسی کی کتابیں لے کر باہر چل دیا۔ واپسی پر وہ افضل اور آصف کے قریب سے گزرا تو اتالیق نے اسے دیکھتے ہی آواز دی۔ "میاں صاحبزادے ذرا ادھر آؤ!" معظم جھجکتا ہوا عمر رسیدہ اتالیق کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اتالیق نے کہا۔ "دکھاؤ کون سی کتابیں پڑھتے ہو تم؟" معظم نے کتابیں آگے بڑھا دیں۔ اتالیق نے یکے بعد دیگرے تمام کتابیں کھول کر دیکھیں اور قدرے حیران ہو کر کہا۔ "تم یہ کتابیں پڑھ سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"میرا مطلب ہے کہ تم انھیں سمجھ بھی سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اچھا ہم تمھارا امتحان لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر اتالیق نے عربی کی ایک کتاب اُٹھا کر کھولی اور

معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ پڑھ کر سناؤ!"

معظم نے اطمینان سے چند سطریں پڑھ کر سنا دیں تو اتالیق نے ترجمہ کرنے کے لیے کہا۔ معظم نے کسی جھجک کے بغیر ترجمہ سنا دیا تو اتالیق نے سوال کیا۔ "تم کہاں تعلیم پاتے ہو؟"

"جی میں افضل کے ساتھ پڑھتا ہوں۔"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"جی اسی محلہ میں اس مکان کے بالکل سامنے۔"

"تم . . . . تم محمود علی خان کے بیٹے ہو؟"

"جی ہاں۔"

اتالیق کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پیچھے سے کسی کی آواز سنائی دی۔ "یہ کون ہے؟"

"اتالیق نے مڑ کر دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ تشریف رکھیے!" مرزا حسین بیگ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ شاید محمود علی کا لڑکا ہے؟"

"جی ہاں میں ابھی اس سے متعارف ہوا ہوں بہت ہونہار بچہ ہے۔ دیکھیے یہ آپ کے کتب خانہ سے صحیح فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ یہ کتابیں اس عمر کے بچوں کے لیے بہت مشکل ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں صاحبزادوں کے ساتھ اسے بھی پڑھا دیا کروں؟"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ غریب لڑکے محنتی ہوتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ آصف اور افضل کے لیے ایسے لڑکے کی رفاقت اچھی رہے گی۔" یہ کہہ کر حسین بیگ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "برخوردار تم مکتب سے چھٹی کے بعد یہاں آجایا کرو۔ میں محمود علی سے بھی کہہ دوں گا۔"

"جی بہت اچھا۔" معظم علی نے تشکر کے ساتھ نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

آصف نے کہا۔ "ابا جان معظم کا بڑا بھائی یوسف علی میرا ہم جماعت ہے اگر آپ کی اجازت ہو تو وہ بھی یہاں آجایا کرے۔"

سین بیگ نے جواب دیا: "اگر تمھارے استاد کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میری طرف سے اجازت ہے۔"

اتالیق نے کہا: "جی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اندرونی چار دیواری کے پھاٹک سے ایک نوکر نمودار ہوا اور اُس نے حسین بیگ کو سلام کرنے کے بعد اتالیق کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ "جناب شیر علی خاں صاحب پوچھتے ہیں کہ صاحبزادے کب فارغ ہوں گے؟"

اتالیق نے جواب دیا۔ "بس میں آج کا کام ختم کر چکا ہوں، یہ جا سکتے ہیں۔"

آصف اور افضل اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

افضل نے کہا: "معظّم آؤ تم بھی، ہم آج کل پستول چلانے کی مشق کر رہے ہیں۔" معظّم علی جھجکتا ہوا اپنے دوستوں کے ساتھ چل دیا۔

حسین بیگ نے اتالیق سے کہا "چلیے آج آپ بھی اپنے شاگردوں کا نشانہ دیکھیے۔"

○

اتالیق کا نام عبدالقدوس تھا اور اس کا شمار مُرشد آباد کے چند چیدہ علماء میں ہوتا تھا وہ حسین بیگ کے ساتھ باتیں کرتا ہوا محل کی اندرونی چار دیواری سے نکل کر بیرونی احاطے میں داخل ہوا تو وہاں پھاٹک سے چند قدم دور دیوار کے ساتھ ایک برآمدے میں بچوں کا فوجی استاد دکھائی دیا، وہ انھیں دیکھتے ہی آگے بڑھا۔ حسین بیگ نے کہا: "ہم آپ کے شاگردوں کا نشانہ دیکھنے آئے ہیں"

شیر علی نے کہا۔ "یہ میری خوش قسمتی ہے اور مجھے امید ہے کہ میرے شاگرد آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ چلیے!"

حسین بیگ نے کہا: "شیر علی! یہ محمود علی کا بیٹا ہے۔ مولوی صاحب نے آج زبردستی اسے اپنا شاگرد بنا لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس کا امتحان لیں۔"

شیر علی نے جواب دیا: "جناب اس کا امتحان لینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے باہر میدان میں گھوڑا بھگاتے اور نشانہ بازی کرتے دیکھا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ نوکروں اور پہریداروں کی کوٹھڑیوں کے قریب پہنچ کر رُکے۔ باہر کی فصیل کے قریب ایک درخت کے نیچے چند سپاہی جمع تھے۔ اور ایک میز پر چار پستول رکھے ہوئے تھے؛ سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی شاخ کے ساتھ ایک تختی لٹک رہی تھی جس کے درمیان پان کی شکل کا ایک سُرخ نشان بنا ہوا تھا۔ سپاہی حسین بیگ کو دیکھ کر ادب سے اِدھر اُدھر ہٹ گئے اور شیر علی کے اشارے پر آصف نے پستول چلا دیا۔ نشانہ سُرخ نشان کے نچلے کنارے پر لگا۔ اس کے بعد افضل کی باری آئی اور اس کی گولی سرخ نشان سے کوئی دو انچ باہر لگی۔ تاہم اس کی عمر کے لحاظ سے یہ بھی ایک کارنامہ تھا اور بوڑھا استاد مرزا حسین بیگ کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا اب دوبارہ کوشش کرو!" اس نے کہا۔

بچوں نے خالی پستول میز پر رکھ دیئے اور بھرے ہوئے پستول اٹھا لیے۔ افضل کی دوسری کوشش قدرے بہتر تھی لیکن آصف کا ہاتھ ہل گیا اور اس کی گولی تختی کو چھوئے بغیر نکل گئی۔ دو سپاہی میز کے قریب کھڑے پستول بھرنے میں مصروف تھے۔ آصف نے اپنی کھسیاہٹ چھپانے کے لیے جلدی سے خالی پستول میز پر رکھا اور بھرا ہوا پستول اٹھا لیا۔ اب اس کی گولی نشانے پر لگی۔ افضل کی باری آئی تو وہ بھرا ہوا پستول اٹھا کر خود نشانہ لگانے کی بجائے معظّم علی کی طرف بڑھا اور بولا: "اب تمھاری باری ہے۔"

معظّم نے قدرے توقف کے بعد اپنی کتابیں ایک سپاہی کے ہاتھ میں دے دیں اور افضل کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔

حسین بیگ نے کہا "میاں صاحبزادے دیکھنا کسی آدمی کو زخمی نہ کر دینا!"

افضل نے کہا: "جی آپ فکر نہ کریں اس کا نشانہ بہت اچھا ہے۔"

معظّم آگے بڑھا۔ اس نے نشان کی طرف دیکھا۔ پھر اچانک پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور

آنکھ جھپکنے کی دیر میں لبلبی دبا دی۔ دیکھنے والے سرخ نشان کے عین وسط میں ایک سوراخ دیکھ رہے تھے۔

معظم علی نے خالی پستول میز پر رکھ دیا اور سپاہی کے ہاتھ سے کتابیں لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ حسین بیگ نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "شاباش! تمھارا نشانہ بہت اچھا ہے۔"

"جی میرے بھائی کا نشانہ مجھ سے بہتر ہے۔"

حسین بیگ نے میز سے ایک پستول اٹھایا اور معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم انعام کے حقدار ہو۔ یہ لو اور دیکھو۔ جب تم بڑے ہو کر جنگ کے میدان سے سرخرو ہو کر آؤ گے تو میں تمھیں اپنے اسلحہ خانے کی بہترین بندوق اور اپنے اصطبل کے بہترین گھوڑے کا حقدار سمجھوں گا۔"

* * *

اس واقعہ کے تین دن بعد حسین بیگ کے ہاں مرشد آباد کے چند امراء کی دعوت تھی اور محمود علی کو پہلی بار اس کے دسترخوان پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ایک ہفتہ بعد حسین بیگ کی بیوی نے شہر کی چند معزز خواتین کو دعوت دی اور اس نے معظم علی کی ماں آمنہ کو بھی مدعو کیا۔ حسین بیگ کی بیوی بظاہر آمنہ کے ساتھ تپاک سے پیش آئی لیکن اونچے طبقے کی اکثر خواتین نے اس کے ساتھ بے تکلف ہونا پسند نہ کیا اور اپنی میزبان کے ظاہری خلوص کے باوجود آمنہ یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ کمسن بچوں کی دوستی اور ان کے دعوتیں اور ملاقاتیں اس خلیج کو نہیں پاٹ سکتیں جو ان کے درمیان حائل ہے۔ فرحت کی عمر اس وقت آٹھ سال کے قریب تھی اور وہ بہت خوبصورت تھی۔ امراء کی چند لڑکیاں جو اپنی ماؤں کے ساتھ اس دعوت میں شریک تھیں اسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں ایک دوسری سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بڑی عمر کی عورتیں اس کی شکل و صورت اور اس کے لباس سے متاثر تھیں اور وہ کسی کو "خالہ جان سلام" اور کسی کو "چچی جان سلام" کہہ کر باری باری سب سے دعائیں لے رہی تھی۔ آمنہ کے کوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ اس کی

طرف بار بار محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی لیکن فرحت نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ ایک بار اس کی ماں نے کہا۔ "فرحت! بیٹی تم نے اپنی خالہ کو سلام نہیں کیا" اور فرحت نے بے توجہی سے آمنہ کی طرف دیکھا اور "خالہ جان سلام" کہہ کر ایک خوش پوش امیر زادی کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی۔ تاہم آمنہ کے دل سے اس کے لیے ہزاروں دعائیں نکل رہی تھیں لیکن کاش یہ شوخ اور حسین لڑکی جسے آمنہ نے پہلی نظر میں ہی اپنی بیٹی سمجھ لیا تھا اس کی دعائیں سن سکتی۔ کاش وہ اونچے طبقے کی دوسری خواتین کی طرح اسے اپنے پاس بٹھا سکتی اس کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر سکتی۔ اس کے سنہری بالوں کو اپنے ہاتھوں سے سنوار سکتی۔ وہ دور ہی دور سے ان شوخ آنکھوں کی طرف دیکھ رہی تھی جن میں ہمالیہ کے دامن کی جھیلوں کی دلکشی اور گہرائی نظر آتی تھی۔ وہ اس کے خوبصورت دانت دیکھ رہی تھی جو ہنستے وقت موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔ دعوت کے اختتام پر وہ اپنے دل میں یہ احساس لے کر نکلی کہ حسین بیگ کی بیوی اور اس کے درمیان اجنبیت کی دیوار بدستور کھڑی ہے۔

لیکن یہ دیوار زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ یوسف اور معظم کے ساتھ افضل اور آصف کی بے تکلفی بڑھتی گئی۔ پہلے جب وہ مدرسے جانے کے لیے بگھی پر سوار ہو کر گھر سے نکلتے تھے تو معظم اور یوسف ڈیوڑھی کے سامنے ان کے انتظار میں کھڑے ہوتے۔ اب اگر انھیں کبھی دیر ہو جاتی تو آصف اور افضل اپنی بگھی ان کے دروازے کے سامنے کھڑی کر کے انھیں بلا لیتے۔ گھر میں اپنے والدین کے ساتھ ان کی باتیں ایک دوسرے کے متعلق ہوتیں۔ "ہم آج فلاں جگہ سیر کے لیے گئے تھے"۔ "آج ہماری فلاں محلے کے لڑکوں کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی۔ ہم صرف چار تھے اور ہم نے اتنے لڑکوں کو مار بھگایا تھا"۔ "آج پیراکی میں ہمارا مقابلہ ہوا تھا اور فلاں سب سے آگے نکل گیا تھا"۔ "آج فلاں نشانہ بازی اور فلاں نیزہ بازی میں اول آیا تھا"۔ حسین بیگ کے گھر میں افضل ہمیشہ معظم علی کی اور آصف ہمیشہ یوسف کی کسی نہ کسی خوبی کی تعریف کرتا۔ اسی طرح جب معظم اور یوسف سونے سے پہلے اپنے والدین کو دن بھر کے واقعات سناتے تو معظم کی زبان پر بار بار افضل کا نام آتا اور یوسف کی زیادہ باتیں عام طور پر آصف کے متعلق ہوتیں۔ چنانچہ ڈیڑھ ماہ کے بعد جب آمنہ دوسری بار حسین بیگ کے ہاں گئی تو افضل کی ماں اس کے ساتھ انتہائی بے تکلفی سے پیش آئی۔

وہ ایک دوسری کو اپنے اپنے بیٹوں کے بچپن کے واقعات سنا رہی تھیں اور فرحت گہری دلچسپی کے ساتھ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ کبھی آمنہ معظم یا یوسف کی کسی شرارت کا ذکر کرتی تو وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔

* * *

وقت گزرتا گیا۔ لڑکپن سے جوانی کی ابتدائی منزل میں قدم رکھتے ہی معظم علی کا بھائی یوسف اور حسین بیگ کے دونوں بیٹے فوج میں بھرتی ہو گئے۔ یوسف ایک سال کی ملازمت کے بعد پچاس سواروں کا افسر بن گیا۔ آصف اور افضل دربار میں اپنے خاندانی اثر و رسوخ کے باعث ترقی کی منازل نسبتاً زیادہ تیز رفتار سے طے کر رہے تھے۔ آصف ایک سال کی ملازمت کے بعد دو سو اور افضل ایک سو سواروں کا کماندار بن چکا تھا۔ معظم علی کا باپ محمود علی اس عرصے میں ترقی کر کے محافظ فوج کے ایک ہزار سواروں کا افسر بن چکا تھا۔ اس کے لیے یوسف کی ترقی کی رفتار اطمینان بخش تھی۔ لیکن معظم علی کے مستقبل کے متعلق وہ پہلے جس قدر پُرامید تھا۔ اب اسی قدر پریشان ہو رہا تھا۔ معظم علی نے فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس میں سپاہیانہ اوصاف کی کمی تھی۔ محمود علی جانتا تھا کہ اس میں ایک سپاہی کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ جرأت، ہمت، عزم اور استقلال کے علاوہ وہ ایک غیر معمولی قوت فیصلہ اور بہترین قائدانہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ کتابوں سے دلچسپی کے باوجود اسے سپاہیانہ زندگی پسند تھی۔ وہ ہر روز علی الصبح سواری، نیزہ بازی اور نشانہ بازی کی مشق کیا کرتا تھا۔ تیر کر دریا عبور کرنا اس کے لیے ایک معمولی بات تھی۔ اسے شکار کا بھی شوق تھا اور اب تک وہ تین شیر اور پانچ چیتے مار چکا تھا۔ لیکن محمود علی جب کبھی اس کے سامنے فوج میں بھرتی ہونے کا مسئلہ چھیڑتا۔ وہ یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرتا: "ابا جان آپ مجھے مجبور نہ کریں۔ مجھے سوچنے کا موقع دیں۔ ابھی میری تعلیم پوری نہیں ہوئی۔ ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے۔" اور آمنہ ہمیشہ اس کا ساتھ دیتی، وہ کہتی: "آپ معظم علی کے متعلق اس قدر پریشان کیوں ہیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے!"

معظم علی اپنا زیادہ وقت عبدالقدوس کے پاس گزارا کرتا تھا۔ ایک دن محمود علی نے جا کر اس سے شکایت کی: "دیکھیے قبلہ! معظم کے مستقبل کے متعلق بہت بڑی توقعات تھیں اور میرا خیال تھا کہ آپ کی شاگردی سے اس کی خداداد صلاحیتیں اور چمک اٹھیں گی۔ لیکن اب اس کی حالت دیکھ کر مجھے بے حد مایوسی ہو رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک سپہ سالار بنے گا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کے سوا اسے کسی چیز سے دلچسپی ہی نہیں۔ اگر میں کسی بڑی جائداد کا مالک ہوتا تو مجھے تمام عمر اس کے گھر بیٹھنے پر اعتراض نہ ہوتا لیکن آپ جانتے ہیں میری جائداد صرف تلوار ہے۔ خدا کے لیے آپ اسے سمجھائیں!"

عبدالقدوس نے اطمینان سے جواب دیا: "آپ کو معظم علی کے متعلق مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دنیا میں نام پیدا کرے گا۔ ایک سلطنت کو سپاہی کی تلوار کے علاوہ عالم کے قلم کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ معظم علی کسی شہر کا قاضی یا صوبے کا حاکم بننے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ آپ اسے پڑھنے کا شوق پورا کرنے دیں، مجھے اس کی خداداد صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔ اس میں اتنی سمجھ ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق خود فیصلہ کر سکے۔ اگر آپ نے اپنا کوئی فیصلہ اس پر ٹھونسنے کی کوشش کی تو یہ اس کے حق میں مضر ہو گا۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہونے دیں۔ اگر اس نے اپنی مرضی سے سپاہی بننے کا فیصلہ کیا تو اس میدان میں بھی عزت اور شہرت کی کوئی منزل اس سے دور نہیں ہو گی۔"

محمود علی نے مطمئن ہو کر کہا: "قبلہ میں معظم سے مایوس نہیں ہوں، لیکن اس کے تمام ساتھی فوج میں شامل ہو چکے ہیں اور لوگ مجھے طعنے دیتے ہیں۔"

"لوگوں کی پروا نہ کیجیے، جو نوجوان اپنے لیے نئے راستے تلاش کرتے ہیں۔ انھیں اپنی عمر کے ایک حصے میں لوگوں کے طعنے سننے ہی پڑتے ہیں۔"

عبدالقدوس کے ساتھ ایک طویل بحث کے بعد محمود علی کی پریشانی کسی حد تک دور ہو چکی تھی اور اس کے بعد اگر اس کا کوئی دوست یہ سوال کرتا کہ معظم علی فوج میں کیوں شامل نہیں ہوا،

تو وہ جواب دیتا:

۔ معظم علی ایک عالم ہے مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے قلم سے بنگال کی زیادہ خدمت کر سکے گا۔"

* * *

فرحت گیارہ سال کی عمر سے پردہ کیا کرتی تھی اور معظم نے اسے گذشتہ دو سال سے نہیں دیکھا تھا معظم کی ماں کبھی کبھی اس کا ذکر کیا کرتی تھی۔ ایک دن وہ اس سے مل کر آئی تو اس نے معظم علی سے کہا۔ "بیٹا آج فرحت تمھارے متعلق پوچھتی تھی!"

معظم علی کے گال اور کان حیا سے سرخ ہو گئے اور اس نے سوال کیا۔ "متعلق کیا پوچھتی تھی؟"

ماں نے جواب دیا: "بیٹا وہ یہ پوچھتی تھی کہ تم فوج میں بھرتی کیوں نہیں ہوتے؟"

معظم نے مسکرا کر کہا: "امی جان مجھے افسوس ہے کہ اب آپ کو میری وجہ سے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔"

ماں نے جواب دیا: "بیٹا اس نے مجھے طعنہ نہیں دیا بلکہ وہ تو اپنی طرف سے ہمدردی کر رہی تھی۔ اور اب وہ چھوٹی لڑکی نہیں۔ ماشاءاللہ اب وہ جوان معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ماں اس کی پیدائش کے دن سے اس کی شادی کی تیاریاں کر رہی ہے۔ مرشد آباد کے بڑے بڑے گھرانوں سے رشتے آچکے ہیں لیکن وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی اور فرحت ہے بھی اس قابل کہ کسی نواب کے گھر جائے۔ مرزا صاحب بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کریں گے۔ لکھنؤ سے مرزا صاحب کے کسی عزیز نے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگا تھا۔ اور حسین بیگ بھی رضامند ہو گئے تھے۔ لیکن فرحت کی ماں نہیں مانتی۔"

معظم جانتا تھا کہ اس کی ماں فرحت سے بہت پیار کرتی ہے اور فرحت کا ذکر آجائے تو اس کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز تبسم لاتے ہوئے ماں کو چڑانے کی نیت سے کہا۔ "امی جان! فرحت وہی لڑکی تو نہیں جس کی ناک چپٹی اور رنگ

سیاہ تھا بالکل توے کی طرح۔ اور اس کی ایک آنکھ بھی ذرا چھوٹی تھی؟"

"شرم کرو!" ماں نے بگڑ کر کہا اور معظم اٹھ کر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ دو سال پہلے کی ایک ایسی صورت کے دھندلے سے نقوش اس کے ذہن پر ابھر رہے تھے جو شوخ بھی تھی اور معصوم بھی۔

چند دن بعد ایک خوشگوار حادثہ پیش آیا۔ معظم علی صبح سویرے کوئی کتاب لینے افضل کے گھر گیا۔ وہ پہلی ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد اندرونی چار دیواری کے پھاٹک کے قریب پہنچا تو آصف اور افضل فوجی لباس پہنے باہر نکل رہے تھے۔ دو نوکر صحن میں ان کے گھوڑے لیے کھڑے تھے۔

معظم نے انھیں دیکھتے ہی کہا۔ "بھائی یوسف کہتے تھے کہ آج چھٹی ہے اور میں کتاب لینے آیا تھا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

افضل نے کہا۔ "آج چھٹی ہے لیکن ہم چوگان کھیلنے جا رہے ہیں۔ آؤ تم کتاب لے لو!"

"لیکن جلدی آنا!" آصف نے کہا۔ "وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"ابھی آتا ہوں۔"

افضل معظم علی کو ساتھ لے کر کتب خانے کے سامنے پہنچا تو باہر کے برآمدے کی طرف کھلنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔

افضل نے کہا۔ "آج ابا جان باہر گئے ہوئے ہیں اور شاید نوکر نے اندر سے یہ دروازہ بند کر دیا ہے۔ آؤ اس طرف چلتے ہیں۔"

وہ واپس مڑے اور دیوان خانے کے ایک وسیع کمرے سے گزر کر اندرونی صحن کے قریب پہنچے تو معظم کچھ سوچ کر رک گیا۔

افضل نے مڑ کر کہا۔ "آجاؤ گھر والے سب اوپر ہیں۔ یہاں کوئی نہیں۔"

معظم علی افضل کے پیچھے صحن سے گزر کر کتب خانے میں داخل ہوا۔ افضل نے کہا۔ "اب تم اطمینان سے کتابیں تلاش کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے میں جاتا ہوں۔"

افضل باہر کا دروازہ کھول کر نکل گیا۔ معظم نے ایک الماری کھولی اور کتابیں نکال نکال کر دیکھنے لگا۔ دو تین الماریوں کو دیکھنے کے بعد وہ کونے کی ایک الماری کے پاس کھڑا ایک کتاب کے ورق الٹ رہا تھا۔ اچانک اسے کسی کے پاؤں کی آہٹ اور معاً بعد ایک دلکش نسوانی آواز سنائی دی: "بھائی جان آپ ابھی تک . . . . ؟"

معظم علی نے مڑ کر دیکھا اور ایک ثانیہ کے لیے متحیر سا ہو کر رہ گیا۔ ایک نوعمر لڑکی جو بے خیالی میں کمرے کے درمیان پہنچ چکی تھی اس کی نسبت کہیں زیادہ بدحواسی کے ساتھ ایک غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کر رہی تھی۔ معظم علی ایک نظر سے زیادہ اس کی طرف نہ دیکھ سکا۔ اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا:۔

"معاف کیجئے میں . . . .؟"

معظم علی اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا — لڑکی فوراً مڑ کر دروازے کی طرف بھاگی اور کمرے سے باہر نکل گئی — روشنی کی کرن کی طرح جو آئینے کو چھونے کے بعد اپنا رُخ بدل لیتی ہے یا سمندر کی لہر کی طرح جو ساحل سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہے۔

یہ لڑکی فرحت تھی۔ معظم علی نے اسے دو سال کے بعد دیکھا تھا اور وہ بھی ایک لمحہ کے لیے۔ اس کے ذہن میں اس کے کوئی واضح نقوش نہ تھے۔ تاہم اُسے یہ احساس ضرور تھا کہ اگر وہ اسے تمام عمر دیکھتا رہتا تو بھی اس کی نگاہوں کی تشنگی دور نہ ہوتی۔ وہ اپنے دل میں ایک خوشگوار دھڑکن محسوس کر رہا تھا۔ لیکن یہ دھڑکن چند لمحوں سے زیادہ نہ رہی۔ معظم علی ہوائی قلعے تعمیر کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ انتہائی سکون کے ساتھ الماری سے ایک اور کتاب نکال کر دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کا یہ خوشگوار تصادم اس کے نزدیک محض ایک حادثہ تھا — ماضی کا حادثہ جس کا اس کے حال اور مستقبل سے کوئی تعلق نہ تھا — وہ جانتا تھا کہ زندگی میں ان کے راستے ایک دوسرے سے جدا ہیں، اور اگر وہ بھٹک کر تھوڑی دیر کے لیے کسی چوراہے پر ایک دوسرے سے آملیں تو بھی ان کی منزل کبھی ایک نہیں ہو سکتی۔ فرحت مرزا حسین بیگ

کی بیٹی تھی اور وہ اتنا شاعر نہ تھا کہ زمین پر کھڑا ہو کر ستاروں سے باتیں کرتا۔

* * *

کوئی آدھ گھنٹہ کی تلاش کے بعد معظم ایک کتاب لے کر باہر نکلا تو برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ کر اسے حسین بیگ دکھائی دیا۔ معظم نے بڑھ کر اسے سلام کیا اور حسین بیگ نے "وعلیکم السلام" کہہ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ معظم علی نے کہا: "میں یہ کتاب لینے آیا تھا۔"

برآمدے میں چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ حسین بیگ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "معظم بیٹھ جاؤ میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

معظم علی اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ حسین بیگ نے قدرے توقف کے بعد کہا: "برخوردار تمھارے متعلق مجھے بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ کتابوں سے دلچسپی کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے باقی فرائض سے آنکھیں بند کر لو۔ ابھی شاہی محل کے باہر تمھارے ابا جان ملے تھے۔ مجھے اُن کی باتیں سن کر بڑا افسوس ہوا۔ میرا خیال تھا کہ تم ایک سپاہی بن کر اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے۔ شیر علی تمھارے متعلق کہا کرتا تھا کہ تم کسی دن سپہ سالار بنو گے۔ لیکن تم کتابوں کے شوق میں خداداد صلاحیتیں ضائع کر رہے ہو۔ آخر تم فوج میں شامل ہونے سے کیوں ڈرتے ہو؟ جسمانی لحاظ سے تم بنگال کے ہزاروں نوجوانوں کے لیے قابلِ رشک ہو۔ نیزہ بازی، شہسواری اور نشانہ بازی میں بہت کم نوجوان تمھارا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ تمھیں خدا نے ذہانت بھی دی ہے، اگر تم اپنے بھائی کی طرح دو سال قبل فوج میں شامل ہو گئے ہوتے تو اب تک شاید دو سو سوار تمھاری کمان میں ہوتے۔ لیکن اگر تمھیں ایک معمولی افسر کی حیثیت سے فوج میں شامل ہونا پسند نہیں تو میں تمھاری سفارش کر سکتا ہوں۔ علی وردی خاں کے ساتھ میرے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ میر مدن میرا دوست ہے۔ اگر تم چاہو تو میں ابھی تمھیں اس کے پاس لے چلتا ہوں۔"

معظم علی نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا: "چچا جان میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے ابتدا نہیں

کرنا چاہتا۔ میں جس فوج کا ادنیٰ سپاہی بننا پسند نہیں کرتا اس کا سپہ سالار بننا بھی پسند نہیں کروں گا۔ جس دن مجھے اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ میں ایک سپاہی بن کر قوم اور وطن کی کوئی خدمت سرانجام دے سکتا ہوں۔ اس دن میرے سامنے یہ سوال نہیں ہوگا کہ میں ایک سپاہی ہوں یا سپہ سالار۔ میرے سامنے صرف یہ سوال ہوگا کہ میں نے جس مقصد کے لیے تلوار اٹھائی ہے وہ کس حد تک پورا ہو رہا ہے۔ اپنے ضمیر کا اطمینان میرے لیے سب سے بڑا انعام ہوگا۔"

حسین بیگ نے کہا۔ "اور وہ دن کب آئے گا جب تم قوم اور وطن کے لیے تلوار اٹھانے کی ضرورت محسوس کرو گے؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "جب ہماری قسمت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی جو اجتماعی حیات کے اصولوں پر یقین رکھتے ہوں۔ موجودہ دور میں ہماری سب سے بڑی بیماری ہماری لامرکزیت ہے اور اس لامرکزیت کا باعث ان بیشمار طالع آزماؤں کی ہوسِ اقتدار ہے جو ہندوستان کو اپنی چھوٹی چھوٹی شکار گاہوں میں تقسیم کر چکے ہیں۔ موجودہ حالات میں ایک سپاہی کی تلوار چند امراء کی مسند کی حفاظت کر کے ان کے اقتدار کی مدت میں چند مہینوں یا چند برسوں کا اضافہ کر سکتی ہے لیکن قوم کی اجتماعی بقا کی ضمانت نہیں دے سکتی۔"

حسین بیگ اس قسم کی گفتگو سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے قدرے تلخ ہو کر کہا۔ "ہماری گفتگو بنگال کی فوج کے متعلق تھی جو ایک طرف مرہٹوں کی لوٹ مار اور دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے جارحانہ عزائم کے خلاف ہمارا واحد سہارا ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "جی ہاں، لیکن بدقسمتی سے علی وردی خاں کی فوج کے سپاہیوں اور جرنیلوں کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ بنگال کے دوست کون ہیں اور دشمن کون ہیں؟"

حسین بیگ فطرتاً حکومت پسند تھا اور علی وردی خاں سے اُسے غایت درجہ کی عقیدت تھی۔ وہ بنگال کے حکمران کی ذات کو تنقید یا تبصرے سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس نے انتہائی کوشش کے ساتھ اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "برخوردار مجھے امید ہے کہ علی وردی خاں کے متعلق بات کرتے وقت

تم سنجیدگی کا ثبوت دو گے اور اس بات کا لحاظ رکھو گے کہ وہ ہمارا حکمران ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "چچا جان معاف کیجیے، میں نے علی وردی خاں کی ذات کے متعلق ابھی تک کچھ نہیں کہا، بیشک وہ ہمارا حکمران ہے۔ لیکن اگر کوئی حکومت اپنے اعمال پر نکتہ چینی کا حق مجھے نہیں دیتی تو وہ مجھ سے اپنی حفاظت کے لیے تلوار اٹھانے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے علی وردی خاں کی بہت سی خوبیوں کا اعتراف ہے۔ ملک کے کئی دوسرے حکمرانوں سے وہ یقیناً بہتر ہیں۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس سلطنت کی مرکزی قوت نہ ہونے کے برابر ہو وہ زیادہ دیر کسی قوم کی آزادی اور بقا کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ آپ اس بات کا اعتراف کریں گے کہ دہلی میں مسلمانوں کی سطوت کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں اور عالمگیرؒ کی عظیم سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کے گھروندے تعمیر کرنے والے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کی جدوجہد کسی اجتماعی نصب العین کے حصول کے لیے نہیں بلکہ محض اپنی ذاتی اغراض کے لیے ہے۔ مسلمان صدیوں کی حکومت کے بعد من حیث القوم اب بتدریج اُس تباہی کا سامنا کر رہے ہیں جو انتشار اور لامرکزیت میں مبتلا ہونے والی اقوام کی آخری سزا ہوتی ہے۔"

حسین بیگ نے کہا۔ "عالمگیرؒ کے جانشین نااہل ہیں اور اب اگر تم دہلی کے دربار کی حالت دیکھو تو علی وردی خاں جیسے لوگوں کا دم غنیمت سمجھو گے۔ اگر ایسے لوگ دہلی کے نااہل اور مفلوج حکمرانوں سے مایوس ہو کر اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ کرتے تو اب تک سارا ملک ہمارے دشمنوں کے قبضے میں چلا جاتا۔ آج مرشد آباد، لکھنؤ اور حیدر آباد کے حالات یقیناً دہلی کے حالات سے بہتر ہیں۔"

"آپ درست کہتے ہیں لیکن آپ آج کی بجائے کل کے متعلق سوچیں۔ درخت سے کٹی ہوئی شاخیں زیادہ دیر سبز نہیں رہتیں۔ میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کے نااہل جانشینوں سے کہیں زیادہ ان قسمت آزماؤں کو موجودہ حالات کا ذمہ دار سمجھتا ہوں جن میں کسی اچھے حکمران کو مسندِ حکومت پر بٹھانے کی جرأت وہمت یا دیانت نہ تھی — دلی کے نااہل، مفلوج اور بے بس حکمران ان کی گروہی سیاست کی پیداوار تھے۔ لال قلعہ ان کے لیے زور آزمائی کا اکھاڑہ تھا۔ بادشاہوں

کے تاج ان کے ہاتھوں کے کھلونے تھے۔ ہر گروہ کی یہ خواہش تھی کہ دہلی کے حکمران کی حیثیت ایک بےبس دعاگو سے زیادہ نہ ہو، اور وہ اس کی سرپرستی میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ ایک گروہ کسی نااہل حکمران کو اپنی بساطِ سیاست کا مہرہ سمجھ کر تخت پر بٹھاتا تھا اور دوسرا گروہ اسے تخت سے اتار کر اس سے زیادہ نااہل امیدوار کے سر پر تاج رکھنے کی جدوجہد شروع کر دیتا تھا۔ اگر ان حالات سے فائدہ اٹھا کر دہلی سے باہر چند صوبہ داروں نے اپنے سروں پر چھوٹے چھوٹے تاج رکھ لیے ہیں تو ہم پر کوئی احسان نہیں کیا۔

اگر دہلی کے امرا نیک نیت ہوتے اور ان کی سیاست قوم کے اجتماعی مفاد کے تابع ہوتی تو وہ یقیناً اپنی ذاتی سودابازیوں کی خاطر نااہل حکمران تلاش نہ کرتے۔ انھوں نے جس مستعدی کے ساتھ چند فاترالعقل حکمرانوں کو تخت پر بٹھانے کی جدوجہد کی تھی۔ اگر اُسی مستعدی کے ساتھ کسی اجتماعی نصب العین کے حصول یا کسی ضابطۂ اخلاق کی فتح کے لیے جدوجہد کرتے تو وہ دہلی کے تخت کے لیے بہترین حکمران تلاش کر سکتے تھے لیکن وہ کسی اصول یا ضابطۂ اخلاق کی فتح کو اپنی ذاتی خواہشوں اور امنگوں کی شکست سمجھتے تھے۔ وہ کسی اصول یا مقصد کے لیے قربانی دینے کی بجائے ہر اصول اور مقصد کو اپنی ذاتی خواہشات پر قربان کرنا سیکھ چکے تھے۔ دہلی کی سلطنت کے زوال کی وجہ صرف یہی نہیں کہ اس کے حکمران بُرے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بے ضمیر امرا جو سلطنت کے ستون کہلاتے تھے ہر برائی میں اپنی بھلائی تلاش کرتے تھے۔"

حسین بیگ کے لیے معظم علی کی گفتگو کا صرف وہ حصہ قابلِ توجہ تھا جو بنگال اور علی وردی خاں کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔ دہلی کے امرا سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی اور معظم علی اگر ان کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کرتا تو بھی اسے اعتراض نہ ہوتا۔ اس نے کہا۔ "برخوردار مجھے دہلی کے امرا یا حکمرانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر انھوں نے برائی کا بیج بویا تھا تو انھیں کئی بار اس کی سزا مل چکی ہے۔ دہلی کئی بار مرہٹوں اور جاٹوں کے ہاتھ لٹ چکی ہے لیکن ہمیں ان لوگوں کا شکرگزار ہونا چاہیے جنھوں نے ایسے حالات میں بھی بنگال، اودھ اور دکن کو تباہی سے بچا لیا ہے۔ وہ ہمارے محسن ہیں۔ بنگال میں علی وردی خاں ہماری عزت اور آزادی کا آخری محافظ ہے۔ خدا

کرے اس کا سایہ چند برس اور ہمارے سر پر رہے اور تم جیسے نوجوان بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں!"

حسین بیگ ان الفاظ پر اس ناخوشگوار بحث کو جو اس کے لیے کافی حد تک ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی، ختم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن معظم علی نے کہا:

"چچا جان آپ بُرا نہ مانیں۔ مستقبل کے مورخ ان صوبہ داروں کو موجودہ صورت حالات کی خرابی سے بری الذمہ قرار نہیں دیں گے جنھوں نے دہلی کے دربار کی سازشوں سے فائدہ اٹھا کر سلطنت کو آپس میں تقسیم کر لیا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی پوری سلطنت پر قبضہ کر لیتا اور اس کا مقصد یہ ہوتا کہ قوم کو تباہی سے بچایا جائے تو کم از کم میں اس سے اس کا حسب و نسب نہ پوچھتا۔ اگر وہ اپنے کردار سے قوم کا نجات دہندہ ثابت ہوتا تو میں ایک رضاکار کی حیثیت سے اس کے جھنڈے تلے جان دینا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا۔ اس کی فوج کا معمولی سپاہی بن کر مجھے یہ اعتماد ہوتا کہ جب وہ کوئی غلط قدم اٹھائے گا تو میں اسے روک سکوں گا۔ اس کی امنگیں میری امنگیں ہوتیں، اس کے دل کی دھڑکنیں، میرے دل کی دھڑکنیں اور اس کے ضمیر کی آواز میرے ضمیر کی آواز ہوتی۔ اور اس کی شکست کو میں اپنی شکست سمجھتا۔ پھر ایسے شخص کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے طالع آزماؤں کے کسی گروہ کی حمایت کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ ایک مقصد کے لیے ایثار اور قربانی کا ولولہ لے کر میدان میں نکلتا اور عوام کی اجتماعی قوت اس کے ساتھ ہوتی۔ وہ عوام کے لیے جھونپڑے تعمیر کرتا اور اس کے اقتدار کی مسند مرمریں ایوانوں کی بجائے ان کے دلوں میں ہوتی۔ لیکن یہ لوگ جنھیں آپ قوم کا نجات دہندہ خیال کرتے ہیں۔ مجھے کسی ایسے اجتماعی اصول کے علمبردار نظر نہیں آتے جس کی فتح کو قوم کی فتح سمجھ سکوں۔ یہ لوگ ہمارے احساس اور شعور کی بجائے ہماری بے حسی کی پیداوار ہیں۔ ان کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر اوپر پھیلی ہوتی ہیں اور جسے گرانے کے لیے ہوا کا ایک جھونکا کافی ہوتا ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیں مرہٹوں کی لوٹ مار اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوسِ ملک گیری سے بچانا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت

نہیں کہ وہ ایک دن مرہٹوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور دوسرے دن ان کے دوست بن جاتے ہیں اور اگر مرہٹے انھیں مدد دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو وہ اپنے مسلمان ہمسایہ پر حملہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ انگریز ہماری آزادی کے بدترین دشمن ہیں۔ لیکن ان میں سے کون ہے جس نے اپنی کسی نہ کسی ذاتی مصلحت کے پیشِ نظر انگریزوں کو اس ملک میں پاؤں جمانے کے لیے مدد نہیں دی؟ ان کا منتہائے نظر صرف ذاتی اقتدار ہے اور مجھے ڈر ہے کہ ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لیے یہ لوگ کسی دن قوم کی بقا کو بھی داؤں پر لگا دیں گے۔"

حسین بیگ نے جھنجھلا کر کہا: "تم علی وردی خاں کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ انگریزوں یا مرہٹوں کے ساتھ کوئی سازباز کر سکتا ہے یا قوم کی آزادی کو داؤں پر لگا سکتا ہے۔"

حسین بیگ کے تیور دیکھ کر معظم چند ثانیے خاموش رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "چچا جان میں نے یہ باتیں اس لیے کہی ہیں کہ میں آپ کی بے حد عزت کرتا ہوں اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو میرے متعلق کوئی غلط فہمی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ آپ علی وردی خاں کا بہت احترام کرتے ہیں لیکن موجودہ حالات سے آپ میری نسبت کہیں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ انگریزوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ لیکن میں جس چیز کو خطرناک سمجھتا ہوں وہ ان کی مصلحتیں ہیں — ایک ایسے حکمران کی مصلحتیں، جس کا اقتدار کسی مقصد کے لیے جدوجہد کا ثمر نہیں بلکہ اپنی ذاتی ذہانت اور حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے۔ جو لوگ کسی مقصد کیلئے جدوجہد کرتے ہیں، ان کی سب سے بڑی پونجی وہ تربیت یافتہ رائے عام ہوتی ہے جسے وہ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے بیدار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا اقتدار اگر لوگوں کی بھلائی کے لیے ہو تو عوام کا اجتماعی شعور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر ان کے لیے کوئی خطرہ پیدا ہو تو رائے عامہ ان کے لیے ڈھال کا کام دیتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے قسمت آزما قسم کے لوگوں سے جوڑ توڑ یا سودے بازی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ان کے دوستوں اور ساتھیوں کو ساری قوم اپنے دوست سمجھتی ہے۔ ان کے دشمن سب کی نگاہوں میں دشمن ہوتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اپنی تمام ذاتی خوبیوں کے باوجود علی وردی

خاں کا شمار ایسے لوگوں میں نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے صرف اپنی ذاتی قابلیت یا ہوشیاری کے بل بوتے پر حکومت حاصل کی ہے۔ اور اس حکومت کے تحفظ کے لیے بھی وہ چند ہوشیار آدمیوں کی حمایت یا دوستی کافی سمجھتے ہیں۔ بنگال کو جب کوئی اندرونی خطرہ پیش آتا ہے تو وہ انگریزوں یا مرہٹوں کی معاندانہ سرگرمیوں سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی بیرونی خطرہ درپیش ہو تو وہ اپنے بدترین غداروں کو بھی معاف کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بیشک وہ ایک ہوشیار سیاست دان اور تجربہ کار جرنیل ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں بنگال کے سپاہی کا ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا اصل محاذ کہاں ہے۔"

حسین بیگ کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ اس نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوتے کہا:

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ علی وردی خاں انتہائی ناقابلِ اعتماد آدمی ہے جو حسبِ ضرورت اپنے دوست اور دشمن بدلتا رہتا ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں نے علی وردی خاں کو ناقابلِ اعتماد نہیں کہا لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو یہ ضرور کہوں گا ان کے گرد ایسے آدمی جمع ہیں جنھیں میں قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا اور اگر ان کے سامنے ایک حکمران کی ذاتی مصلحتیں نہ ہوتیں تو ان کے دربار میں ان لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی۔"

حسین بیگ نے کہا: "اور تم یہ بھی کہتے ہو کہ علی وردی خاں کے سپاہیوں کو یہ علم نہیں کہ ان کا محاذ کہاں ہے؟"

"جی ہاں اور میں غلط نہیں کہتا!"

"شاید علی وردی خاں کو بھی یہ علم نہ ہو کہ ان کا محاذ کہاں ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے بتا دو اور میں اس کے کانوں تک تمھاری یہ آواز پہنچا دوں؟"

معظم علی نے حسین بیگ کی طنز سے بھری ہوئی مسکراہٹ کی کوئی پروا نہ کی۔ اس نے جواب دیا۔ ”جی انھیں بتلانے کی ضرورت نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میر جعفر جیسے لوگ کسی کے وفادار نہیں ہو سکتے۔“

حسین بیگ کو میر جعفر کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی تاہم وہ علی وردی خاں کی فوج کے ایک افسر کے بیٹے کی زبان سے اس کے خلاف کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو برخوردار اگر تم فوج میں شامل نہیں ہونا چاہتے تو میں تمھیں مجبور نہیں کر سکتا لیکن علی وردی خاں کے ساتھیوں کے متعلق زبان کھولتے وقت تمھیں محتاط رہنا چاہیے۔ یہ لوگ سلطنت کے ستون ہیں اور تمھارا والد فوج کا ملازم ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تمھارے خیالات اس قدر باغیانہ ہیں۔ میں نے انتہائی ضبط سے کام لے کر تمھاری باتیں سنی ہیں۔ لیکن اس مکان کی چار دیواری سے باہر اگر تم نے کسی کے ساتھ اس قسم کی باتیں کیں تو تمھارے لیے اچھا نہ ہوگا۔ تم افضل اور آصف کے دوست ہو اور میں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم ان کے سامنے ایسے خیالات کی تبلیغ کرو۔ تم ابھی بچے ہو۔ لیکن وقت آنے پر تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ علی وردی خان بنگال کے مسلمانوں کا آخری سہارا ہے۔“

معظم علی نے کرسی سے اٹھ کر کہا۔ ”چچا جان اگر میں نے کوئی تلخ بات کہہ دی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن آپ یقین رکھیں وقت آنے پر میں یہ ثابت کر سکوں گا کہ بنگال کے مسلمانوں کا مستقبل مجھے کسی سے کم عزیز نہیں۔“

* * *

اگلے روز معظم اور یوسف، اپنے باپ کے ساتھ عشاء کی نماز کے لیے مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ حسین بیگ کے نوکر نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ رک گئے اور نوکر نے قریب آ کر محمود علی سے
مرزا صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔“

محمود علی نے لڑکوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”تم جاؤ میں ان سے مل آؤں۔“

محمود علی نوکر کے ساتھ چلا گیا تو یوسف نے معظم علی سے کہا۔ ”معظم! مرزا صاحب نے ابا جان کو جس دست بلایا ہے۔ خیر تو ہے؟“

معظم نے جواب دیا۔ ”بھائی جان معلوم ہوتا ہے آج میری شامت آئے گی۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”کل میری باتوں سے مرزا صاحب خفا ہو گئے تھے۔“

”کیوں، تم نے ان سے کیا کہا تھا؟“

”وہ میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کے متعلق پریشان تھے۔ اور میں نے ان کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”اور اب وہ زیادہ پریشان ہوں گے۔ تم نے علی وردی خاں کے متعلق ضرور کوئی ایسی ویسی بات کہی ہوگی؟“

”میں نے موجودہ حالات پر تبصرہ کیا تھا اور انھوں نے شاید یہ سمجھا کہ میں علی وردی خان کی حکومت کا باغی ہوں۔“

”تمھیں مرزا صاحب کے ساتھ نہیں الجھنا چاہیے۔ وہ پرانی وضع کے آدمی ہیں، اور علی وردی خاں کے ساتھ ان کے مراسم بہت گہرے ہیں۔“

یوسف اور معظم نے نماز کے بعد کچھ دیر محمود علی کا انتظار کیا اور پھر گھر کی طرف چل دیے۔ گھر پہنچ کر وہ صحن میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد محمود علی بھی آگیا اور اس نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ”معظم! تم نے کل مرزا صاحب سے کیا باتیں کی تھیں؟“

”ابا جان میں نے ان کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی کہ میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کی وجہ خوف یا کاہلی ہے۔ مرزا صاحب بہت زیادہ خفا تو نہیں تھے؟“

”نہیں، بلکہ وہ اس بات پر پریشان تھے کہ وہ تمھارے ساتھ سختی سے پیش آئے تاہم

وہ تاکید کرتے تھے کہ تمھیں علی وردی خاں اور ان کے امرا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔"

معظم علی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ابا جان انھوں نے یہ تو ضرور کہا ہو گا کہ میں بہت نالائق ہوں۔"

"نہیں، وہ یہ کہتے تھے کہ تمھارا بیٹا میرے لیے ایک معما ہے، کبھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ ایک سادہ دل نوجوان ہے اور کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہے۔ وہ کہتے تھے ایسے نوجوان یا تو دنیا میں نام پیدا کرتے ہیں اور یا اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے لیے مصیبت کا باعث بن جاتے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "ابا جان میں بھائی جان سے ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ وہ میری شکایت کریں گے اور آپ گھر آکر میری خوب مرمت کریں گے۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ وہ آئندہ مجھے اپنے گھر کی چار دیواری کے قریب نہیں پھٹکنے دیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔"

"تم نے ان سے میر جعفر کے خلاف کچھ کہا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"وہ ہر اس آدمی کو اچھا سمجھتے ہیں جو میر جعفر کو برا خیال کرتا ہے۔"

"لیکن انھوں نے مجھے تو ڈانٹ دیا تھا۔"

"یہ ان کی ظاہر داری تھی لیکن تمھیں ایسے خیالات کسی اور کے سامنے ظاہر نہیں کرنے چاہئیں۔"

"ابا جان میں محتاط رہوں گا۔"

"مرزا صاحب ایک اور بات کہتے تھے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ کہتے تھے کہ معظم علی کے لیے میرے کتب خانے کا دروازہ ہر وقت کھلا رہے گا لیکن مجھے اس دن خوشی ہو گی جب یہ میرے اسلحہ خانے سے تلوار اور میرے اصطبل سے گھوڑا لینے آئے گا۔"

دوسرا باب

ایک دن مرشد آباد میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ پنڈت بھاسکر کی قیادت میں راگھو جی بھونسلہ کی چالیس ہزار مرہٹہ فوج بردوان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ علی وردی خاں مرشد آباد سے باہر شکار کھیل رہا تھا۔ اس نے مرہٹوں کی پیشقدمی کی خبر ملتے ہی بردوان کا رخ کیا اور مرشد آباد اور دوسرے شہروں کی افواج کو یہ حکم بھیجا کہ وہ راستے میں اس کے ساتھ آملیں۔ دو دن کے اندر اندر مرشد آباد کی چھاؤنی خالی ہو گئی اور سپاہیوں کے صرف چند دستے شہر اور شاہی محل کی حفاظت کے لیے رہ گئے۔ چند دن بعد یہ خبر آئی کہ علی وردی خاں کا ایک کمان دار میر حبیب اور فوج کے چند اور افسر بنگال سے غداری کر کے مرہٹوں کے ساتھ مل گئے ہیں اور پنڈت بھاسکر نے یہ اعلان کیا ہے کہ بنگال کی فوج سے غداری کرنے والوں کو مرہٹہ فوج میں اپنے سابقہ عہدوں پر لے لیا جائے گا۔ مرشد آباد میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔

محمود علی، یوسف علی اور حسین بیگ کے دونوں بیٹے آصف بیگ اور افضل مرشد آباد کی فوج کے ساتھ محاذ جنگ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

معظم علی کو پہلی بار نہایت شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہوا کہ محلے کے وہ لوگ جن کے بیٹے جنگ کے لیے جا چکے ہیں۔ اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

شاہی محل کا داروغہ معظم علی کے باپ کا دوست تھا اور وہ ہر روز علی الصباح اس کے پاس جنگ کے تازہ حالات معلوم کرنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ داروغے

ل کر واپس آیا تو اسے اپنی ماں کا چہرہ بے حد مغموم دکھائی دیا۔

"کیا ہوا امی جان؟" اس نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں بیٹا! کوئی اچھی خبر آئی ہے؟"

"ہاں امی جان آج کی خبریں کچھ اچھی ہیں۔ مرہٹے چند جھڑپوں کے بعد پیچھے ہٹ گئے ہیں لیکن ابھی کوئی فیصلہ کن معرکہ نہیں ہوا۔ آپ اس قدر غمگین کیوں ہیں؟"

"بیٹا!" ماں نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے فرحت سے یہ توقع نہ تھی۔"

"کیا ہوا امی جان؟" معظم نے بدحواس ہو کر سوال کیا۔ "فرحت نے کیا کہا؟"

"اس میں فرحت کا قصور نہیں بیٹا۔ اصل میں وہ لڑکیاں جو اس کے ساتھ آئی تھیں بہت بدتمیز تھیں۔"

"فرحت یہاں آئی تھی؟"

"ہاں وہ ابھی گئی ہے۔"

"آخر کیا کیا اس نے؟"

ماں نے اُٹھ کر ایک الماری سے کانچ کی چند چوڑیاں نکالیں اور معظم علی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو! فرحت آج اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ آئی تھی۔ اس کے ساتھ سلطان خاں کی لڑکی بھی تھی۔ مجھے وہ کبھی پسند نہیں آئی۔ لیکن آج اس نے بہت زیادتی کی۔ پہلے اس نے یہ کہا کہ تم بزدلی کی وجہ سے فوج میں شامل نہیں ہوئے۔ پھر اس نے اپنی چوڑیاں اتار کر میرے سامنے رکھ دیں اور کہنے لگی معظم بھائی کو ہماری طرف سے یہ تحفہ دے دیجیے۔"

تھوڑی دیر کے لیے معظم علی کی رگوں کا خون سمٹ کر اس کے چہرے میں آگیا۔ اس نے کہا۔ "اور فرحت نے کیا کہا؟"

"فرحت نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ اپنی سہیلیوں کا منہ بند کرے گی۔ لیکن وہ خاموشی سے ہنستی رہی۔"

"امی جان اگر آپ کو ایسی باتوں سے صدمہ ہوا ہے تو میں اکیلا مرہٹوں کے لشکر کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔ وقت آنے پر کوئی آپ کے بیٹے کو بزدل نہیں کہے گا اور وہ سلطان خاں جس کی صاحبزادی نے آپ کو میرے لیے چوڑیاں دی ہیں خود مرہٹوں کے حملے کی خبر سنتے ہی شہر سے ہجرت کے لیے تیار ہو گیا تھا اور میں نے اسے بڑی مشکل سے روکا تھا۔ امی جان میں فوج کے ساتھ اس لیے نہیں گیا کہ موجودہ حالات میں میرا مرشد آباد میں رہنا زیادہ ضروری ہے۔ شہر سپاہیوں سے قریباً خالی ہو چکا ہے۔ اگر دشمن نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر چند تیز رفتار دستے اس طرف بھیج دیئے تو یہ محلّہ تو درکنار شاہی محل بھی محفوظ نہیں رہے گا اور شہر سے باہر یہ ہمارا محلہ تو بہت ہی غیر محفوظ ہے۔ میں مرزا صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔"

"لیکن بیٹا خدا کے لیے فرحت کی شکایت نہ کرنا۔ اس کی نیت بری نہ تھی۔"

معظم علی نے کہا۔ "نہیں امی جان میں آصف اور افضل کی بہن کی شکایت نہیں کر سکتا لیکن یہ چوڑیاں سنبھال کر رکھیے۔"

* * *

معظم علی، حسین بیگ کے محل میں داخل ہوا تو وہ بیرونی احاطے میں بندوق سے نشانہ بازی کر رہا تھا اور آٹھ دس سپاہی اس کے گرد کھڑے تھے۔ معظم علی کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور جب حسین بیگ اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے کہا۔

"چچا جان آج میں کتب خانہ کی بجائے آپ کا اسلحہ خانہ دیکھنے آیا ہوں۔"

حسین بیگ مسکرایا۔ "تمھیں تلوار کی ضرورت ہے یا بندوق کی؟"

"ابھی مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ آپ کے کتب خانے میں ڈیڑھ ہزار کتابیں ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے اسلحہ خانے میں کتنا سامان ہے؟"

"اگر استعمال کرنے والے ہوں تو سامان بہت ہے۔ لیکن میں تمھاری اس اچانک دلچسپی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔"

معظم علی نے جواب دیا: "شہر فوج سے خالی ہو چکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر دشمن نے ہوشیاری سے کام لیا تو مرشدآباد پر اچانک قبضہ کر لینا اس کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ اور یہ محلہ تو بہت ہی غیر محفوظ ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو آپ کا مکان اس محلے کے لیے قلعے کا کام دے سکتا ہے۔ آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر مجھے کسی فوجی عہدہ کی ضرورت ہو تو آپ میری سفارش کر سکتے ہیں۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس قلعے کا محافظ مقرر کر دیا جائے۔"

حسین بیگ نے کہا: "لیکن میرے پاس صرف پندرہ تربیت یافتہ سپاہی اور پانچ چھ بیکار نوکر رہ گئے ہیں۔ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو تم اتنے آدمیوں کے ساتھ کیا کر سکو گے؟"

"آدمیوں کی فکر نہ کیجیے۔ خطرے کے وقت محلے کا ہر آدمی یہاں پہنچ جائے گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انھیں تربیت دینے کا موقع مل جائے۔ انھیں اسلحہ اور بارود کی ضرورت ہوگی اور یہ فراہم کرنا آپ کا کام ہوگا۔"

"برخوردار تم نے میرا اسلحہ خانہ نہیں دیکھا۔ میرے پاس کوئی اڑھائی سو بندوقیں اور قریباً اتنے ہی پستول اور تلواریں ہیں۔ بارود اتنا ہے کہ اگر استعمال کرنے والے ہوں تو وہ ایک ہفتے میں بھی ختم نہیں ہوگا۔ دو توپیں جو میں نے پانچ سال قبل خریدی تھیں اندر پڑی ہوئی ہیں اور آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ انھیں کہاں نصب کیا جائے۔ اب اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو یہ فیصلہ اس قلعہ کا محافظ کرے گا۔"

"تو آپ کو میری خدمات منظور ہیں؟"

حسین بیگ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "معظم علی میں تمھیں اپنے قلعے کا محافظ اور اپنی ان افواج کا سپہ سالار مقرر کرتا ہوں جن کی تعداد سر دست پندرہ تربیت یافتہ اور چھ غیر تربیت یافتہ سپاہیوں سے زیادہ نہیں۔"

معظم علی نے کہا: "آپ کا سپہ سالار آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔"

حسین بیگ نے معظم کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا میں تم سے کبھی مایوس نہ تھا۔"

معظم نے کہا: "ہمیں آج ہی اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ آج شام آپ محلے کے بااثر لوگوں کو یہاں جمع ہونے کی دعوت دیں!"

"بہت اچھا، لیکن میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمھیں اچانک یہ خیال کیسے آیا ہے کہ مرشدآباد کو واقعی کوئی خطرہ ہے؟"

"چچا جان اگر خطرہ نہ ہو تو بھی ہمیں تیار رہنا چاہیے۔ ابھی آپ نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا تھی کہ آپ ہنگامی حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہتے ہیں۔"

حسین بیگ نے جواب دیا: "یہ درست ہے کہ محاذ پر اپنے سپاہی بھیج دینے کے بعد مجھے کبھی کبھی یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ اگر کوئی مرہٹہ اس طرف آنکلے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ ہمارے گھر میں فرحت ایسی باتیں سوچا کرتی ہے۔ جس دن سے آصف اور افضل گئے ہیں۔ وہ صبح شام باقاعدہ نشانہ بازی کی مشق کیا کرتی ہے۔ ایک دن اس نے خواب دیکھا تھا کہ ڈاکو ہمارے گھر میں گھس آئے ہیں۔ احتیاط کرنا اچھی بات ہے، تاہم میں یہ نہیں سمجھتا کہ مرہٹے محاذِ جنگ چھوڑ کر اس طرف آنکلیں گے۔ لیکن تم اس مسئلہ میں بہت سنجیدہ ہو اور تمھاری باتوں سے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرہٹوں کا لشکر واقعی مُرشدآباد کا رُخ کر رہا ہے۔"

معظم علی نے کہا: "چچا جان میرے خدشات بلا وجہ نہیں۔ مرہٹے فتح کی بجائے لوٹ مار کے لیے آئے ہیں۔ اب تک انھوں نے اپنے راستے کی بستیوں اور شہروں کو برباد کیا ہے لیکن بہت کم مقامات ایسے ہیں جن پر انھوں نے قبضہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ بنگال کی زیادہ دولت مرشدآباد میں ہے اور ہمارے غدار

جوان کے ساتھ جا ملے ہیں۔ انھیں یہ بھی بتا چکے ہوں گے کہ مُرشدآباد پر حملہ کرنے سے کسی فائدے کی امید نہ ہو تو بھی وہ محاذِ جنگ سے ہماری فوج کی توجہ ہٹانے کے لیے چند دستے اس طرف بھیج سکتے ہیں۔ آپ میر حبیب کو جانتے ہیں وہ ایک ہوشیار آدمی ہے۔ اور مُرشدآباد کے چپے چپے سے واقف ہے۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو اب تک مرشدآباد پر قبضہ کر چکا ہوتا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ جگت سیٹھ نے اپنے محل کی حفاظت کے لیے ڈیڑھ سو آدمی بھرتی کیے ہیں اور ہمارے استاد شیر علی کو بھی ملازم رکھ لیا ہے۔ آج صبح جب میں محاذِ جنگ کی خبریں معلوم کرنے کے لیے شاہی محل کے داروغہ کے پاس جا رہا تھا تو راستے میں شیر علی خاں ملے اور انھوں نے اصرار کیا کہ میں بھی جگت سیٹھ کی ملازمت کر لوں۔ لیکن نے جواب دیا کہ میں ایک کروڑ پتی مہاجن کے خزانوں کی حفاظت کرنے کی بجائے اپنے محلے کے کسی غریب آدمی کے دروازے پر پہرہ دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ چچا جان ہو سکتا ہے کہ میرے خدشات محض وہم ثابت ہوں۔ لیکن جب تک جنگ ختم نہیں ہوتی اور ہماری فوج واپس نہیں آتی میں اطمینان کا سانس نہیں لے سکتا۔ اب اگر اجازت ہو تو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے محل کی دفاعی حالت کیسی ہے اور اسے بہتر بنانے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

”بہت اچھا تم اپنا کام کرو، میں محلے کے آدمیوں کو دعوت بھیجتا ہوں۔“ یہ کہہ کر حسین بیگ اپنے نوکروں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم سب اچھی طرح سن لو کہ آج سے معظم علی تمھارا حاکم ہو گا اور اسے کسی شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔“

* * *

شام کے وقت حسین بیگ کے دستر خوان پر محلے کے تیس چیدہ چیدہ آدمی جمع تھے پہلے حسین بیگ نے انھیں جمع کرنے کی غرض و غایت بیان کی اور اس کے بعد معظم علی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مہمانوں کی اکثریت یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ مُرشدآباد کو کوئی خطرہ پیش آ سکتا ہے۔ وہ محض احتیاط کے طور پر اپنے اپنے زیرِ اثر لوگوں کو منظم کرنے کے لیے تیار تھے

صرف دس آدمی ایسے تھے جنھیں حسین بیگ اور معظم علی کے خیالات سے پوری طرح اتفاق تھا اور جنھوں نے ان کے ساتھ صدقِ دل سے تعاون کا وعدہ کیا۔

اگلے دن صرف بیس نوعمر لڑکے اور تیس بڑی عمر کے آدمی جن میں سے اکثر محلے کے غریب دُکاندار، مزدور اور چند امیر گھروں کے نوکر تھے۔ حسین بیگ کے مکان پر حاضر ہوئے حسین بیگ کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی لیکن معظم علی کے نزدیک یہ ابتدا بُری نہ تھی۔ اس نے اسلحہ خانے سے بندوقیں نکال کر ان میں تقسیم کیں اور انھیں محلے سے باہر ایک کھلے میدان میں نشانہ بازی کے لیے لے گیا۔ دوسرے دن پندرہ اور آدمی ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور ایک ہفتہ کے بعد معظم علی سے فوجی تربیت حاصل کرنے والے رضاکاروں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچ گئی۔

اس کے اپنے دو نوکر صابر اور جمال خاں بھی رضاکاروں میں شامل ہو چکے تھے۔ جمال خان چند برس بنگال کی فوج میں ملازمت کر چکا تھا۔ لیکن صابر کو تلوار اور بندوق سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف جمال خاں کی رقابت کی وجہ سے رضاکاروں کی پریڈ میں شامل ہوتا تھا۔ تین دن اپنے ساتھیوں کے قہقہے سننے کے بعد ایک روز محض اتفاق سے اس کا پہلا نشانہ ہدف پر لگا اور وہ بندوق وہیں پھینک کر بھاگتا ہوا معظم کے پاس پہنچا اور بلند آواز میں چلایا:

”سرکار میرا نشانہ ٹھیک ہو گیا ہے اب مجھے چھٹی دیجیے، گھر میں بہت کام ہے۔“

معظم علی کی یہ مہم اب آہستہ آہستہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ کچھ لوگ اپنی مرضی سے اور کچھ مجبوراً اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ہر روز تین چار گھنٹے رضاکاروں کو تربیت دینے کے بعد حسین بیگ کے محل میں چلا جاتا۔ جہاں حسین بیگ نے اس کی ہدایات کے مطابق چالیس مزدور پرانی دیواریں مرمت کرنے اور مختلف مقامات پر مورچے بنانے کے کام پر لگا رکھے تھے۔ معظم علی ان کا کام دیکھتا۔ محل کے مختلف گوشوں میں چکر لگاتا اور اگر کوئی نئی بات ذہن میں آتی تو انھیں ہدایات دے کر چلا آتا۔ پھر وہ محلے کی گلیوں میں پھرتا اور خاص خاص مقامات

پر مورچے تعمیر کرنے کا مشورہ دیتا۔ چند دنوں میں محلے کی ہر گلی کے ناکے پر پھاٹک لگ چکے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ بھی اس کام میں دلچسپی لینے لگے جو چند دن پہلے اپنے گھروں میں بیٹھ کر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد قریباً ہر روز اس کے چند چیدہ چیدہ ساتھی حسین بیگ کے مکان پر جمع ہو کر دن بھر کی کارگزاری کا جائزہ لیتے اور اگلے دن کے لیے پروگرام بناتے۔

* * *

ایک دن مرزا حسین بیگ کی دعوت پر شیر علی نے اس کی حویلی کے دفاعی انتظامات کا معائنہ کیا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ بیرونی فصیل کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اینٹوں کے ستون تعمیر ہو رہے ہیں۔ اس کے استفسار پر معظم علی نے بتایا کہ فصیل زیادہ چوڑی نہیں۔ جب ان ستونوں پر لکڑی کے تختے ڈال دیئے جائیں گے تو سپاہیوں کے لیے جگہ نکل آئے گی۔ فصیل کا کنارہ ذرا اونچا ہو گا۔ اور یہ سپاہیوں کے لیے ڈھال کا کام دے گا، باقی تین طرف یہ کام ختم ہو چکا ہے۔ چلیے آپ کو دکھاتا ہوں۔"

شیر علی نے بیرونی احاطے میں فصیل کا چکر لگانے کے بعد حسین بیگ سے کہا "مرزا صاحب آپ نے تو اس مکان کو قلعہ بنا دیا ہے۔"

معظم علی نے کہا: "ڈیوڑھی کی چھت پر بھی ہمارا مورچہ کافی مضبوط ہے۔ لیکن یہ سب عارضی انتظامات ہیں۔ اگر وقت ہوتا تو میں مرزا صاحب کو یہ چار دیواری گرا کر نئی فصیل تعمیر کرنے کا مشورہ دیتا۔ چلیے آپ کو اندرونی حصہ دکھاتا ہوں۔"

شیر علی ان کے ساتھ اندرونی احاطے میں داخل ہوا۔ معظم علی نے اسے رہائشی مکان کی نچلی منزل کی کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے ریت کی بوریوں کے مورچے دکھانے کے بعد کہا: "آپ اسی قسم کے انتظامات بالائی منزل میں بھی دیکھیں گے۔ میں نے چھتوں پر بھی مورچے بنوا دیئے ہیں اگر دشمن اندرونی احاطے تک پہنچ گیا تو اسے ہر کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں کے علاوہ چھتوں اور برآمدوں کے مورچوں سے گولیوں کی بارش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تاہم میں ان انتظامات کو کافی نہیں سمجھتا۔ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ اندرونی احاطے کی دیواریں بہت کمزور ہیں۔ اور ان کی بلندی بھی زیادہ نہیں — دشمن بیرونی احاطے میں داخل ہونے کے بعد انہیں آسانی سے پھاند کر اندر آ سکتا ہے ان کی بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ انہیں اونچا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے میرا ارادہ ہے کہ اس کے آگے ایک خندق کھود دی جائے اور اسے پانی سے بھر دیا جائے۔ اس کے بعد اگر وقت ملا اور مرزا صاحب نے میری تجویز سے اتفاق کیا تو خندق کے ساتھ بانس گاڑ دیئے جائیں گے، جو قریباً ایک گز زمین کے اندر اور کوئی اڑھائی گز زمین کے باہر ہوں گے۔ بانس کی یہ باڑھ زیادہ مضبوط نہیں ہو سکتی لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ دشمن دیوار پھاندنے اور خندق عبور کرنے کے بعد براہِ راست رہائشی مکان میں ہمارے آخری مورچوں پر حملہ نہیں کر سکے گا۔ مکان کے مورچوں سے ہماری گولیاں خندق میں گرنے والوں کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیں گی۔ مرزا صاحب کے پاس دو توپیں ہیں اور انہیں دروازے کے سامنے نصب کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس طرف صحن میں ایک کھائی کھودی جائے گی جس میں پچاس ساٹھ سپاہی چھپ کر بیٹھ سکیں گے۔ اگر دشمن نے دروازہ توڑ کر اندر آنے کی کوشش کی تو اسے سب سے پہلے ہماری توپوں کی آتش بازی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پھر بھی یہ تمام انتظامات عارضی ہیں اور ایک غیر متوقع حملے کے پیش نظر کیے گئے ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ مرہٹے بیرونی فصیل توڑنے یا پھاندنے کے بعد کسی منظم فوج کی بجائے ایک میلے کی بھیڑ کی شکل میں اندرونی احاطے میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ اور ان کا نصب العین صرف لوٹ مار ہو گا۔ اگر ہم نے ایک بار ان کے دانت کھٹے کر دیئے تو وہ دوبارہ حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔"

شیر علی نے کہا: "لیکن برخوردار! اتنے بڑے کام کے لیے ایک طویل عرصہ چاہیئے۔ تمہارے خیال میں ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں کتنا وقت لگے گا؟"

"اگر پچاس ساٹھ آدمی روز کام پر لگا دیئے جائیں تو یہ کام چند دن میں ختم ہو سکتا ہے لیکن

بدقسمتی سے مرزا صاحب کو میری بہت سی تجاویز سے اتفاق نہیں۔"

حسین بیگ نے شیر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "مجھے معظم کی کسی تجویز سے اختلاف نہیں لیکن اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت وقت چاہیے۔ اور پھر اگر ہمارا یہ وہم غلط ثابت ہوا۔ کہ مرہٹوں کی فوج محاذ جنگ چھوڑ کر اس طرف آنکلے گی تو شہر کے لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔ اوروں کو تو چھوڑیئے میرے اپنے بیٹے واپس آکر یہ کہیں گے کہ اباجان آپ کو کیا ہوگیا تھا۔ اب بھی یہ حالت ہے کہ مرشدآباد میں میرے بعض دوست میری دماغی حالت پر شبہ کرتے ہیں۔"

شیر علی نے کہا: "مرزا صاحب! لوگوں کی نکتہ چینی کی پروا نہ کیجیے۔ خدا کرے کہ مرشدآباد کے متعلق ہمارے خدشات بے بنیاد ثابت ہوں لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ مرہٹے اگر میدانِ جنگ سے شکست کھا کر واپس بھی چلے گئے تو ہمیں مستقبل میں کوئی اور خطرہ پیش نہیں آسکتا۔ موجودہ دور میں ہمیں ہر وقت غیر متوقع حالات کا مقابلہ کرنے کے تیار رہنا چاہیے۔ عقلمند لوگ ہمیشہ بارش سے پہلے اپنے مکانوں کی چھتیں مرمت کرتے ہیں اور موجودہ زمانے میں بارش سے زیادہ دشمن کے حملے کے متعلق سوچنا پڑتا ہے۔ بعض گھٹائیں برسات کے موسم میں بھی برسے بغیر گزر جاتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ جو لوگ بارش کے آثار دیکھتے ہی اپنی چھتوں اور پرنالوں کی مرمت کا کام شروع کردیتے ہیں وہ احمق ہیں۔"

حسین بیگ نے کہا: "محلے میں میرے متعلق یہ بات بھی مشہور ہو چکی ہے کہ میرے پاس بڑا خزانہ ہے اور میں یہ سب کچھ اس کی حفاظت کے لیے کر رہا ہوں۔"

شیر علی نے کہا: "مرزا صاحب آپ اپنا کام جاری رکھیے۔ اگر آپ کے پاس خزانہ نہیں تو شاید کسی دن خزانوں والے یہاں پناہ لینے پر مجبور ہوجائیں۔ جگت سیٹھ اپنے خزانے کی حفاظت کے لیے بہت فکرمند ہے۔ اب تک وہ اپنے محل کو دفاعی لحاظ مضبوط بنانے کے لیے ہزاروں روپے خرچ کرچکا ہے۔ مجھے اس نے اپنے محل کا محافظ مقرر کیا ہے لیکن اب

تک میں نے جو کچھ کیا ہے وہ معظم علی کی اس کارگزاری کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ معظم علی نے اس محلے کے لوگوں میں جو مدافعانہ جذبہ بیدار کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ لیکن جگت سیٹھ نے جو کرائے کے سپاہی بھرتی کیے ہیں ان میں سے بعض کے متعلق تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ خطرے کے وقت وہ شاید اپنی بندوقوں کی حفاظت بھی نہ کرسکیں۔"

وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ رہائشی مکان کی دوسری طرف بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ شیر علی نے چونک کر کہا: "یہ بندوق کی آواز شاید اندر سے آئی ہے۔"

حسین بیگ مسکرایا: "یہ افضل کی بہن ہوگی۔ وہ بالائی منزل کے دریچے سے بندوق چلانے کی مشق کیا کرتی ہے۔"

تھوڑی دیر اور باتیں کرنے کے بعد شیر علی نے حسین بیگ سے رخصت چاہی۔ معظم علی اسے ڈیوڑھی تک چھوڑنے کے لیے آیا۔ دروازے پر پہنچ کر شیر علی نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "معظم آج جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس کے بعد مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کئی سال فوج میں ملازمت کرنے کے بعد بھی تمھارے مقابلہ میں میری معلومات بہت کم ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں تم کسی دن تھوڑی دیر کے لیے جگت سیٹھ کے محل میں آکر میرے انتظامات کا جائزہ لو۔ یقیناً تم مجھے کوئی کارآمد مشورے دے سکو گے؟"

"آپ جس وقت حکم دیں، میں حاضر ہوں۔"

"اگر فرصت ملے تو آج ہی کسی وقت آجاؤ!"

"بہت اچھا، میں آج ظہر کی نماز کے بعد حاضر ہوجاؤں گا۔"

* * *

چند دن بعد حسین بیگ کے محل کے بیرونی احاطے اور فصیل کے دفاعی انتظامات مکمل ہوگئے تو معظم علی نے اندرونی چار دیواری کے ساتھ خندق کھودنے کو کہا۔

حسین بیگ نے جواب دیا: "جو کچھ ہم کرچکے ہیں کافی ہے۔ ہمیں اس گھر کا حلیہ اس قدر

نہیں بگاڑنا چاہیئے کہ سارا مکان گرا کر از سرِ نو تعمیر کرنا پڑے۔"

"بہت اچھا چچا جان! جیسے آپ کی مرضی۔ اتنی تیاری سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم دشمن کو چند گھنٹوں کے لیے روک سکیں گے۔"

معظّم علی یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا لیکن حسین بیگ کے کانوں میں اس کے الفاظ دیر تک گونجتے رہے وہ سارا دن بےچین رہا اور رات کے وقت بھی اسے اچھی طرح نیند نہ آئی۔

اگلے دن علی الصباح معظّم علی اپنے گھر میں گہری نیند سو رہا تھا کہ صابر نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا "سرکار! مرزا صاحب باہر کھڑے ہیں۔"

"مرزا حسین بیگ؟" معظّم علی نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں سرکار۔ شاید وہ کہیں جا رہے ہیں۔"

معظّم علی جلدی سے اٹھا اور بھاگتا ہوا باہر نکلا۔

"آپ! اس وقت؟" اس نے حسین بیگ کو دیکھتے ہی کہا۔

"دیکھو بیٹا!" حسین بیگ نے کسی تمہید کے بغیر کہا "کل تم سے باتیں کرنے کے بعد میں نے یہ سوچا کہ جب اتنا کچھ کیا ہے تو خندق بھی کھود دی جائے۔ لیکن وہ بس اتنی گہری ہو کہ دشمن اندرونی دیوار پھاندنے کے بعد آسانی سے مکان پر حملہ نہ کر سکے۔ لیکن تم یہ وعدہ کرو کہ اس کے بعد خندق کے آگے بانس گاڑنے کی تجویز پر زور نہیں دو گے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ مرشد آباد کے لوگ مجھے سچ مچ پاگل سمجھنے لگ جائیں۔"

معظّم علی جانتا تھا کہ ایک کام ختم ہونے کے بعد وہ خود بخود دوسرا کام شروع کروا دیں گے۔ تاہم اس نے کہا "چچا جان میں تو خندق کے لیے بھی آپ کو مجبور نہیں کرتا۔"

"نہیں نہیں خندق ضرور کھودی جائے گی۔ میں اس کا فیصلہ کر چکا ہوں لوگ بھونکتے رہیں مجھے ان کی پروا نہیں۔"

"بہت اچھا چچا جان۔ لیکن آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں دیہات سے آدمی بلانے کے لیے جا رہا ہوں۔ یہ شہر کے لوگ بیکار ہیں۔ یہ کام کرنے کی بجائے میرا مذاق اڑائیں گے۔ دوپہر تک میرے علاقے کے ڈیڑھ دو سو کسان یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد اگر زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑی تو دریا پار کی جاگیر کے کسانوں کو بھی بلوا لوں گا لیکن یہ کام چار دن کے اندر اندر ختم ہو جانا چاہیئے۔" حسین بیگ نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

تیسرے پہر حسین بیگ کے مکان میں خندق کی کھدائی کا کام شروع ہو چکا تھا۔ اور اس کے لنگر خانے میں کوئی دو سو آدمیوں کے لیے کھانا تیار ہو رہا تھا۔

اگلے دن حسین بیگ کا ایک دوست اس کے پاس آیا اور اس نے پوچھا "مرزا صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟"

مرزا صاحب سے پہلے بھی کئی آدمی یہ سوال کر چکے تھے۔ انھوں نے جھنجھلا کر کہا۔

"دیکھیے صاحب یہ میرا اپنا مکان ہے۔ اگر میں اسے کھود کر ایک تالاب بنوا دوں تو بھی آپ کو یہ پوچھنے کا حق نہیں۔"

دوست نے دوبارہ اس موضوع پر زبان کھولنے کی ضرورت محسوس نہ کی جب وہ چلا گیا تو حسین بیگ نے ایک نوکر سے کہا:

"دیکھو آئندہ جو لوگ مجھ سے ملنے آئیں انھیں لانے کی بجائے باہر کی بیٹھک میں روک لیا کرو!"

چند دن بعد خندق تیار ہو گئی اور حسین بیگ نے حویلی سے بارش کا پانی خارج کرنے والی نالیوں کا رخ اس طرف پھیر دیا۔ اس کے بعد اگلے دن محلّے کے لوگوں نے دیکھا کہ حسین بیگ کی حویلی میں بانسوں سے لدے چھکڑے چلے آ رہے ہیں وہ حیران تھے۔ لیکن کسی کو حسین بیگ کے سامنے اپنی حیرانی کے اظہار کی جرأت نہ ہوئی۔

اس دوران میں معظّم علی بلاناغہ محلّے کے رضاکاروں کو تربیت دیتا رہا تھا۔ ابتدائی

جوش وخروش رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا اور رضاکاروں کی تعداد بڑھنے کی بجائے روز بروز کم ہو رہی تھی۔ تاہم اسے اس بات سے اطمینان تھا کہ وہ محلّے کے اکثر لوگوں کو بندوق چلانا سکھا چکا ہے۔ اب وہ لوگ بھی جو بظاہر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ درپردہ اپنے اپنے گھروں کی حفاظت کے انتظامات کر رہے تھے۔ معظّم علی کی تحریک کے اثرات مرشد آباد کے دوسرے محلّوں میں بھی پہنچ چکے تھے اور نوجوانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد شہریوں میں مدافعانہ شعور بیدار کرنے کے لیے میدان میں آچکی تھی۔

◆

ایک دن معظّم علی نے محلّے کے تمام رضاکاروں کو حسین بیگ کے مکان میں جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ”بھائیو اور بزرگو! چند ہفتے قبل مرشد آباد سے فوج کی روانگی کے بعد میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اگر خدانخواستہ مرشد آباد کو کوئی خطرہ پیش آیا تو شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے ہمارا محلہ انتہائی غیر محفوظ ہوگا۔ لیکن آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شاہی محل کے بعد ہمارا محلہ سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ اب اگر کسی نے ہم پر حملہ کیا تو وہ ہمیں بھیڑوں کی طرح نہیں ہانک سکے گا۔ پہلے تو ہم دشمن کو گلیوں کے دروازوں سے باہر روکیں گے۔ پھر اگر وہ ہمارے ابتدائی مورچے توڑ کر اندر گھس آیا تو ہم اپنے مکانوں کی چھتوں اور دیواروں سے گولیاں برسائیں گے۔ اس کے بعد اگر ہمیں اور پیچھے ہٹنا پڑا تو یہ حویلی ہمارے لیے آخری حصار ثابت ہوگی۔ خطرے کے وقت محلے کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو یہاں پناہ مل سکے گی اور ہم اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھ کر ان کی حفاظت کر سکیں گے۔ آپ اس حویلی کے اندر اور باہر اپنا اپنا مورچہ دیکھ چکے ہیں۔ اب وہ لائحہ عمل سن لیں جس کے مطابق ہمیں کام کرنا ہوگا۔ خطرے کے وقت سب سے پہلے محلے کے اندر اور باہر مختلف مقامات پر پہرہ دینے والے رضاکار نقارے بجائیں گے۔ اس وقت آپ کو چاہیئے کہ آپ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو ابھی سے یہ سمجھا دیں کہ وہ کسی بدحواسی کا مظاہرہ نہ کریں اور نقارے کی

آواز سنتے ہی اس حویلی کے رہائشی مکان میں جمع ہو جائیں۔ یہاں اتنی جگہ ہے کہ محلّے کی تمام عورتیں اور بچے سما سکیں۔ نقارے کی آواز کے تھوڑی دیر بعد حویلی کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ آج دوپہر کے بعد ہم اس کی مشق بھی کریں گے۔

شام سے قبل کسی وقت نقارے بجائے جائیں گے اور ہم یہ دیکھیں گے کہ کسی غیر متوقع صورتِ حالات کا سامنا کرنے کے لیے ہم کس حد تک تیار ہیں۔ دن کے وقت عورتیں اور بچے اپنی اپنی جائے پناہ دیکھ لیں گے اور اس کے بعد رات کو کسی وقت یہ مشق دوبارہ کی جائے گی۔

ایک عمر رسیدہ آدمی نے اٹھ کر سوال کیا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ رات کے وقت بھی ہمارے بال بچوں کو اٹھ کر اس طرف بھاگنا پڑے گا؟“

معظّم علی نے جواب دیا۔ ”ہاں لیکن رات کے اندھیرے میں وہ بھاگ نہیں سکیں گے انہیں تاریک گلیوں سے گزر کر یہاں پہنچنا ہوگا۔ حویلی کے اندر صرف چند منٹ کے لیے مشعلیں جلائی جائیں گی تاکہ وہ اپنی اپنی جائے پناہ دیکھ سکیں۔“

ایک اور آدمی نے اٹھ کر کہا۔ ”لیکن یہ تو عجیب بات ہوگی۔ عورتیں اور بچے رات کے وقت یہاں کیسے پہنچیں گے؟“

تیسرا بولا۔ ”ہم آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن رات کے وقت عورتوں اور بچوں کا یہ تماشا ٹھیک نہیں ہوگا۔“

معظّم علی نے جواب دیا۔ ”اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ دشمن صرف دن کے وقت حملہ کرے گا تو میں اپنی ماؤں اور بہنوں کو یہ تکلیف دینا گوارا نہ کرتا۔ لیکن موجودہ حالات میں میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ رات کے وقت اگر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو تو بھی ہمیں یہ مشق ضرور کرنی چاہیئے۔ میں جانتا ہوں کہ بعض کوتاہ اندیش لوگ روزِ اول سے ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ گذشتہ چند برس میں ہندوستان کے بڑے بڑے شہر کئی بار لٹ چکے ہیں اور عافیت پسند لوگوں نے وہ مصائب اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔

"یہ مرہٹے بھاگ گئے" کے نعروں میں دب کر رہ گئی۔

اس نے ایک رضاکار کو گردن سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "تمھیں فصیل سے اترنے کی اجازت کس نے دی۔ جاؤ اپنے مورچے میں!"

نوجوان مرعوب سا ہو کر دوبارہ لکڑی کی سیڑھی سے فصیل پر چڑھ گیا۔ دوسرے رضاکار تذبذب کی حالت میں کھڑے تھے۔ معظم علی غضب ناک ہو کر چلایا: "تم کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ اپنے مورچوں میں!"

وہ بادل ناخواستہ دوبارہ اپنے مورچوں میں چلے گئے۔ لیکن ان کے آگے باقی ساری فصیل کے مورچے خالی ہو چکے تھے اور دروازے کی سمت لوگوں کے نعرے ہر آن بلند ہو رہے تھے۔ معظم علی بھاگتا ہوا ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ معظم علی کو دیکھ کر ایک رضاکار نے بلند آواز میں کہا: "ہماری فوج کو فتح ہوئی ہے۔ مرہٹے اب اس طرف نہیں آئیں گے۔ اب آپ کو اس محلے کی فکر نہیں کرنی چاہیئے۔"

معظم علی نے کہا: "اگر فتح کی خبر سننے کے بعد تمھاری افراتفری کی یہ حالت ہے تو مجھے اب زیادہ فکر مند ہونا چاہیئے۔ فتح کی خبر کون لایا ہے؟"

رضاکار نے جواب دیا۔ "اشرف خاں شاہی محل سے یہ اطلاع لے کر آیا تھا۔ ہم گلی کا دروازہ بند کر چکے تھے، وہ آ پہنچا۔"

"اور تم نے دروازہ کھول دیا؟"

"ہاں۔"

"لیکن میری ہدایت تھی کہ جب تک دوسرا نقارہ نہ بجایا جائے۔ گلیوں کے دروازے نہ کھولے جائیں۔"

"لیکن وہ فتح کی خبر لے کر آیا تھا۔"

معظم علی نے کہا: "تم جیسے احمق کبھی کبھی بڑی سے بڑی فتح کو شکست میں بدل دیتے

ہیں۔ اگر مجھے وہ اختیارات ہوتے جو فوج کے ایک افسر کو اپنے ماتحت سپاہی پر ہوتے تو میں تمھیں بدترین سزا دیتا۔"

دوسرے رضاکار نے کہا: "لیکن جناب اب تو کوئی بھی اپنے مورچے پر نہیں۔ گلیوں کے تمام پہریدار ڈیوڑھی سے باہر کھڑے ہیں۔"

معظم علی لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ چند بچے اور عورتیں جن کے لیے اندر یا باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا ڈیوڑھی کی دیواروں کے ساتھ سمٹی ہوئی تھیں۔ باہر اشرف خاں کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا اور وہ ان کے سامنے جنگ کی ایسی تفصیلات بیان کر رہا تھا جن کا واقعات سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ شاہی محل کے ایک سپاہی نے صرف یہ سنا تھا کہ مرہٹے پسپا ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ لوگوں کو یہ بتا رہا تھا کہ بنگال کی افواج میدان میں دشمن کی لاشوں کے ڈھیر لگانے کے بعد سرحد کے پاران کا تعاقب کر رہی ہیں۔

چند عورتیں یہاں بھی ہجوم کے درمیان پھنسی ہوئی تھیں اور بچے بلبلا رہے تھے۔ معظم علی نے لوگوں کو ملامت کی اور وہ ایک طرف ہٹ گئے۔

اشرف خاں، معظم علی کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور اس نے کہا: "جناب آپ فتح کی خبر سن چکے ہیں؟"

"میں سن چکا ہوں۔ اور اب میں آپ لوگوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ یہاں سے ہٹ جائیے چند خواتین ڈیوڑھی کے اندر پھنسی ہوئی ہیں۔"

معظم علی یہ کہہ کر واپس مڑا اور اس نے حسین بیگ کے ایک نوکر کو جو ابھی تک ڈیوڑھی کی چھت پر اپنے مورچے میں بیٹھا ہوا تھا۔ نقارہ بجانے کے لیے کہا۔ ایک عمر رسیدہ آدمی نے ہنستے ہوئے کہا: "اب نقارہ بجانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو یوں بھی سب لوگ چھٹی کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اندرونی صحن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے سامنے عورتوں اور بچوں کا ہجوم تھا۔ معظم علی

بندھے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کی کھرلیوں کے اوپر دیوار میں لگی ہوئی کھونٹیوں کے ساتھ گھوڑوں کی لگامیں اور زینیں ٹنگی ہوئی تھیں۔ اپنی ضرورت کے مطابق گھوڑے تیار کرنے کے بعد معظم علی کے ساتھیوں نے باقی تمام گھوڑے کھول کر ڈیوڑھی کے سامنے جمع کیے پھر حویلی کا پھاٹک کھول دیا گیا اور وہ گھوڑوں کا ریوڑ ہانکتے ہوئے باہر نکل آئے۔

گھوڑوں کی ٹاپ سن کر گاؤں کے پہریدار بھاگتے ہوئے اس تنگ گلی میں داخل ہوئے لیکن وہ گھوڑوں کے سموں تلے پس کر رہ گئے۔

چند منٹ بعد جب ساتھ والی حویلی کے محافظ بندوقیں چلا کر اور نقارے بجا کر لوگوں کو خبردار کر رہے تھے۔ معظم علی اور اس کے ساتھی گاؤں سے باہر مرہٹہ فوج کا پڑاؤ عبور کر رہے تھے اور پھر جب پڑاؤ کے سپاہی اپنے خیموں سے باہر نکل کر انتہائی پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ لوگ دو تین میل آگے جا چکے تھے۔

مرلی دت حویلی میں شور سن کر گہری نیند سے بیدار ہوا اور لیٹے لیٹے اپنے سپاہیوں کو آوازیں دینے لگا۔ سپاہی بھاگ کر اس کی چھولداری میں داخل ہوئے تو اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں جناب!“ ایک سپاہی نے جواب دیا۔ ”ساتھ والی حویلی سے گھوڑے کھل کر باہر نکل گئے ہیں۔“

”گھوڑے باہر کیسے نکل گئے؟“ اس نے برہم ہو کر سوال کیا۔

”پتا نہیں کیسے نکل گئے جناب! حویلی کا دروازہ کھلا ہے اور پہریدار کہیں غائب ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھوڑوں کو روکنے کے لیے ان کے پیچھے گئے ہیں۔“

”کتنے گھوڑے بھاگ گئے ہیں؟“

”جناب تمام نکل گئے ہیں وہاں ایک بھی نہیں رہا۔“

مرلی دت بستر سے اٹھا اور سپاہیوں کو دھکے دیتا ہوا باہر نکل کر بولا۔ ”تم پاگل ہو۔ تمام گھوڑے خود بخود کیسے بھاگ سکتے ہیں۔“

پھر وہ بھاگتا ہوا حویلی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے اسے مشعل کی روشنی میں چوکی کا محافظ دکھائی دیا۔

”کیا ہوا جناب؟“ اس نے ہانپتے ہوئے سوال کیا۔ ”گھوڑے خود بخود کیسے نکل گئے؟“

”گھوڑے ڈاکو لے گئے ہیں۔“

”لیکن پہریدار کہاں گئے تھے؟“

”پہریداروں کو ہم نے ایک کوٹھڑی سے نکالا ہے۔ تم اپنے قیدیوں کا خیال رکھو!“

”جناب قیدیوں کی آپ فکر نہ کریں۔ لیکن اتنے گھوڑوں کا نقصان!“

مرلی دت کا ایک سپاہی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے دو سپاہیوں کے گم ہو جانے کی اطلاع دی۔

مرلی دت نے سوال کیا۔ ”تم نے قیدیوں کی کوٹھڑیاں دیکھی ہیں؟“

”ہاں جناب! وہ تو بند ہیں اور ان میں تالے لگے ہوئے ہیں۔“

ایک دوسرا سپاہی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی۔ ”جناب قیدی اندر سے کوئی آواز نہیں دیتے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پیچھے کی دیوار میں نقب لگا کر دوسری حویلی میں نہ چلے گئے ہوں۔“

مرلی دت نے برہم ہو کر کہا۔ ”قیدی ناخنوں سے ڈیڑھ گز چوڑی دیوار نہیں کھود سکتے وہ صرف ہماری پریشانی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔“

چوکی کے محافظ نے کہا۔ ”میں قیدیوں کی کوٹھڑیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد مرلی دت مشعل کی روشنی میں اپنا صندوق خالی دیکھنے کے بعد چلا چلا کر اکبر خاں کو آوازیں دے رہا تھا اور چوکی کا محافظ چند افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ اس کے سر پر کھڑا تھا۔

ایک اور پہریدار بھاگتا ہوا چھولداری میں داخل ہوا اور اس نے چلا کر کہا۔ ”سرکار غضب

انھیں دیکھ کر روٹ آیا اور دروازے کے پاس ہی چھپر کے نیچے پڑی ہوئی ایک کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد حسین بیگ کا ایک نوکر باہر نکلا اور معظم علی نے اس سے پوچھا: "مرزا صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ اس وقت کتب خانے میں ہیں۔"

"اچھا اب تم خواتین سے کہو کہ ان کے لیے راستہ خالی ہو چکا ہے۔"

"بہت اچھا۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو بندوقیں اسلحہ خانے سے تقسیم کی گئی تھیں ان کے متعلق کیا ہدایت ہے؟"

معظم علی نے کہا: "ابھی انھیں رضا کاروں کے پاس رہنے دو۔"

* * *

تھوڑی دیر بعد محلے کے ہر گھر میں مرزا حسین بیگ کے متعلق اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔

"مرزا حسین بیگ کو کسی نجومی نے بنایا تھا کہ مرہٹے تمھارے محل پر حملہ کریں گے"۔۔۔۔

"اس نے خواب دیکھا تھا کہ ڈاکو اس کے گھر میں گھس آئے ہیں۔" "حسین بیگ ایک سیدھا سادہ آدمی ہے۔ اور محمود علی کے لڑکے نے اسے بیوقوف بنایا ہے۔"

رات کے وقت فتح کی خوشی میں محلے کی ہر گلی میں چراغ جلائے جا رہے تھے۔ جگت سیٹھ کے محل میں آتش بازی چلائی جا رہی تھی۔ حسین بیگ کے محل میں بھی چراغاں ہو رہا تھا۔ بازاروں اور گلیوں میں چہل پہل تھی۔ معظم علی عشاء کی نماز کے بعد اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا گزشتہ چند دن کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ جمال خاں نیچے صحن میں اپنی کھاٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک معظم علی کو گلی میں شور سنائی دیا اور اس نے اوپر سے آواز دی:

"صابر! صابر!"

جمال خاں نے جواب دیا: "جی صابر ابھی باہر گیا ہے۔"

معظم علی نے کہا: "اچھا تم جا کر دیکھو باہر کیا ہو رہا ہے۔"

جمال خاں بھاگ کر باہر نکلا۔ لیکن چند منٹ تک وہ واپس نہ آیا تو معظم علی نیچے اتر آیا جب وہ باہر نکلا تو جمال خاں اور صابر واپس آتے دکھائی دیے۔

معظم علی نے کہا: "بہت دیر لگائی تم نے کیا بات تھی؟"

جمال خاں نے جواب دیا۔ "جی کچھ نہیں محلے کے چند لڑکے صابر کے ساتھ لڑ رہے تھے، میں پہنچا تو وہ بھاگ گئے۔"

"کیا بات تھی صابر؟"

صابر نے جواب دیا۔ "جی وہ آپ کا مذاق اڑا رہے تھے۔ انھوں نے مرزا صاحب کے متعلق بھی بہت واہیات باتیں کیں۔ وہ کہتے تھے کہ آپ نے لوگوں کو بیوقوف بنایا تھا اور مرزا صاحب کے ساتھ کسی نجومی نے مذاق کیا تھا۔ ان باتوں پر مجھے غصہ آگیا۔"

"میں جانتا ہوں جو کچھ انھوں نے کہا ہوگا۔ تمھیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"جی نہیں ذرا نکسیر پھوٹ گئی ہے۔ لیکن میں نے دو لڑکوں کو خوب پیٹا ہے۔"

"بہت برا کیا تم نے۔ بڑوں کو بچوں کے ساتھ نہیں لڑنا چاہیئے!"

"جناب وہ بچے کہاں تھے، ایک تو مجھ سے بھی آدھ بالشت اونچا تھا۔"

"اچھا اب آرام کرو اور آئندہ اگر کوئی مجھے کچھ کہے تو تمھیں لڑنے کی ضرورت نہیں۔"

تیسرا باب

اگلے دن آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ معظم علی صبح کا ناشتہ کھا کر ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ دس بجے کے قریب حسین بیگ کا نوکر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ مرزا صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں۔

معظم علی محل میں پہنچا، حسین بیگ دیوان خانے کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے معظم علی کو دیکھتے ہی کہا: "آؤ بیٹا میں ابھی شاہی محل کے ناظم اور مرشدآباد کے فوجدار سے مل کر آیا ہوں۔ فتح کی خبر درست ہے۔ ہماری افواج نے کٹوے پر دوبارہ قبضہ کرلیا ہے۔ مرہٹوں نے شہر خالی کرنے سے پہلے کٹوے اور آس پاس کی بستیوں میں خوراک کے تمام ذخیرے تباہ کر دیئے تھے۔ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں۔ اور فوج کا سامان رسد بھی ختم ہوچکا ہے۔ آج مرشدآباد سے اناج بھیجا جارہا ہے۔ مرہٹے بھاری نقصان اٹھانے کے بعد کٹوے سے چند میل پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ لیکن ابھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ واپس چلے جائیں گے یا کوئی اور محاذ تلاش کریں گے۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ مرشدآباد کو اب کوئی خطرہ نہیں۔ تمھیں محلّے کے طرزِ عمل سے پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ گھروں میں بیٹھ کر ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن ہم نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ لوگ بکتے رہیں مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں فوج کے واپس آجانے پر بھی اپنی حویلی کے دفاعی انتظامات بہتر بنانے کا کام جاری رکھوں گا۔ برسات کے بعد بیرونی فصیل کی مرمت کی جائے گی اور اندرونی دیوار کو گرا کر از سرِ نو تعمیر کیا جائے گا۔ اور یہ سارا کام تمھاری مرضی کے مطابق

ہوگا۔"

معظم علی نے کہا: "چچا جان میں لوگوں کے طرزِ عمل سے پریشان نہیں ہوں اور میرے نزدیک مرشدآباد کا خطرہ کم نہیں ہوا۔ کٹوے سے فرار ہونے کے بعد مرہٹے یہ سوچ رہے ہوں گے کہ بنگال کا کونسا شہر ایسا ہے جس پر وہ آسانی سے قبضہ کر سکتے ہیں اور جہاں سے انھیں زیادہ سے زیادہ مال غنیمت مل سکتا ہے۔ اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب ان کا ہدف میدنا پور یا کٹک ہوگا۔ یا وہ مرشدآباد کا رخ کریں گے۔ ان کے لیے مرشدآباد پہنچنا نسبتاً مشکل ہوگا۔ لیکن اگر انھوں نے مرشدآباد کی دولت کا دوسرے شہروں سے مقابلہ کیا تو وہ مشکلات کی پروا نہیں کریں گے۔"

حسین بیگ نے کہا۔ "مرشدآباد کی دفاعی حالت اتنی کمزور نہیں۔ فوج اگرچہ یہاں کافی نہیں لیکن اتنی کم بھی نہیں کہ بیرونی حملہ آور کو ایک دو دن بھی روک نہ سکے۔ پھر علی وردی خاں اتنا نادان نہیں کہ وہ مرشدآباد کو خطرے میں دیکھ کر کٹوے میں بیٹھا رہے۔ اگر مرہٹوں نے اس طرف کا رخ کیا تو علی وردی خاں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہاں پہنچ جائے گا۔"

معظم علی نے کہا: "اور یہی بات ہے جس سے میں ڈرتا ہوں۔ دشمن کو اگر مرشدآباد کا رُخ کرنے میں کسی فائدے کی اُمید نہ ہو تو بھی وہ صرف علی وردی خاں کی توجہ دوسرے محاذ پر مبذول کرنے کے لیے چند دستے مرشدآباد کی طرف روانہ کرسکتا ہے۔ دارالحکومت کو خطرے میں دیکھ کر علی وردی خاں ایک لمحہ کے لیے بھی کٹوے میں ٹھہرنا گوارا نہیں کریں گے۔ بیشک ان کے یہاں پہنچ جانے سے مرہٹوں کا بھاگ جانا یقینی ہے۔ لیکن مرہٹوں کی باقی فوج کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر میدنا پور پر قبضہ کرلے گی اور اس کے بعد بردوان کا سارا علاقہ خطرے میں پڑ جائے گا۔"

حسین بیگ نے دل برداشتہ ہوکر کہا: "تو پھر علی وردی خاں کو کیا کرنا چاہیئے؟ تمھارا خیال ہے کہ اگر مرہٹوں کا کوئی لشکر مرشدآباد پہنچ جائے تو اسے ان کا پیچھا نہیں کرنا چاہیئے؟"

"نہیں چچا جان۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ علی وردی خاں کے سالاروں نے اسے صحیح مشو

کیے جائیں تو یہ مشکل نہیں۔ ہم میر حبیب سے تمام باتیں معلوم کر سکتے ہیں۔ میر حبیب نے ہمارے ساتھ صلح کی درخواست کی ہے اور ہم صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے میر جعفر کی سرکردگی میں ایک وفد اس کے پاس بھیج رہے ہیں۔"

معظم علی نے بدحواس ہو کر سوال کیا: "آپ میر حبیب سے صلح کرنا چاہتے ہیں؟"

ہاں! ہم اڑلیسہ پر مرہٹوں کے پے درپے حملوں سے تنگ آ چکے ہیں۔ میر حبیب بعض شرائط پر اڑلیسہ کی حفاظت کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہے اس کے ایلچی دو بار ہمارے پاس آ چکے ہیں۔ میر جعفر کا خیال ہے کہ وہ ہماری ملازمت اختیار کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔ اگر میر جعفر نے اسے رام کر لیا تو ہم اسے بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔ مرہٹوں کے ساتھ نپٹنے کے لیے اس سے بہتر آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تم نہایت وقت پر آتے ہو اور میری خواہش ہے کہ اس کے ساتھ صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے تمھیں بھی میر جعفر کے ہمراہ بھیج دیا جائے۔"

معظم علی کچھ دیر حیرت و استعجاب کے عالم میں علی وردی خاں کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "عالیجاہ! اگر یہ گستاخی نہ ہو تو میں کچھ عرض کروں!"

"کہو!"

"میر حبیب جیسے لوگوں سے ہم کلام ہونے کے لیے ہمیں تلوار کی زبان کی ضرورت ہے۔ میں بھیڑیوں سے بھیڑوں کی حفاظت کا کام لینے کی منطق کا قائل نہیں۔ میں میر حبیب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک غدار ہے اور ایک غدار پر دوبارہ اعتماد کرنا پرلے درجے کی خود فریبی ہوگی۔ اگر وہ صرف آپ کا دشمن ہوتا تو آپ اس کا ماضی فراموش کرنے میں حق بجانب ہوتے۔ لیکن وہ آپ کی حکومت سے زیادہ بنگال کے باشندوں کی عزت و آزادی اور بقا کا دشمن ہے اور بنگال کا کوئی محبِ وطن اس کا ماضی فراموش کرنے کی غلطی نہیں کرے گا۔

میں آپ کی فوج میں اس لیے شامل ہوا تھا کہ میں اپنے دل میں بنگال کی عزت اور آزادی

کے لیے ایک تڑپ محسوس کرتا تھا۔ میرے ساتھیوں نے آپ کا پرچم بلند رکھنے کے لیے پیش کیا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ آپ کے دشمنوں کو بنگال کا دشمن اور بنگال کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اب اگر آپ نے اپنا نظریہ بدل لیا ہے تو ایسے لوگوں کو اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑے گا جو اپنے خون کی روشنائی سے قوم کی آزادی کی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں۔"

علی وردی خاں نے کہا: "کاش قوم میں تمھارے جیسے چند اور نوجوان ہوتے۔ میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن تمھیں ہماری مجبوریوں کا علم نہیں۔ میں بیک وقت ان ان گنت طالع آزماؤں کے ساتھ کیسے نمٹ سکتا ہوں جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو حکومت کی مسند کا واحد حقدار سمجھتا ہے۔ موجودہ حالات میں میر حبیب کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھانا میرے لیے ایک مجبوری ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "آپ اس لیے مجبور ہیں کہ آپ حکومت کا کاروبار چلانے یا ہنگامی حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے چند طالع آزماؤں کے درمیان توازن قائم رکھنا کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن میں ان جاہ پسندوں میں سے کسی کو بھی قوم کی عزت اور آزادی کا امین نہیں سمجھتا۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ قوم کی اجتماعی قوت مدافعت ہی ہماری بقا اور آزادی کی ضمانت دے سکتی ہے۔ یہ ابن الوقت، یہ غدار اور یہ اقتدار کی مسندوں کے لیے بے حیا دعویدار، عوام کی بے حسی، بددلی اور مایوسی کی پیداوار ہیں اور میں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ سودا کرنے کی بجائے آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ان کے خلاف قوم کی قوتِ محاسبہ بیدار کریں۔ یہ وہ ناسور ہیں۔ جنھیں کاٹ کر جڑ سے نکالے بغیر ایک صحت مند قوم کی تخلیق ممکن نہیں۔ اور جو حکومت ایک صحت مند قوم کی تخلیق سے قاصر رہتی ہے اس کے لیے گھر کے غدار بیرونی حملہ آوروں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں؟"

علی وردی خاں نے قدرے تلخ ہو کر کہا: "نوجوان تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہو۔ میر حبیب کے خلاف تمھارے غم و غصہ کی وجہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں لیکن موجودہ حالات میں

دیا تو اس فتح کے بعد مرہٹوں کو کسی اور محاذ کا رخ کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ میرے خیال میں یہی چند دن ایسے ہیں جب مرہٹوں پر ضرب کاری لگائی جا سکتی ہے۔"

حسین بیگ نے کہا: "اچھا بتاؤ اگر تم علی وردی خان کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟"

معظم علی مسکرایا اور اس نے قدرے توقف کے بعد کہا: "میں اگر ان کی جگہ ہوتا۔ تو اس فتح کے بعد ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ان کا تعاقب جاری رکھتا۔ میں کٹوے میں پڑاؤ ڈال کر مرشد آباد اور دوسرے شہروں سے سامانِ رسد کا انتظار کرنے کی بجائے اپنے بھوکے سپاہیوں سے یہ کہتا کہ ہمارے پاس رسد کی کمی ہے۔ لیکن ہم مرہٹوں سے اناج کے وہ ذخیرے چھین سکتے ہیں جو انھوں نے اس علاقے کو لوٹ کر جمع کیے ہیں۔ اس صورت میں مرہٹوں کے سامنے صرف اپنی جانیں بچانے کا مسئلہ ہوتا۔ مرہٹے کسی منظم فوج کے سپاہی نہیں صرف لیٹرے ہیں۔ ان کی گذشتہ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ایک محاذ سے نقصان اٹھانے کے بعد جوابی حملہ کے لیے ہمیشہ کوئی نیا محاذ تلاش کرتے ہیں۔ اور اگر ان کا مدمقابل چوکس ہو تو وہ تیاری کا موقع حاصل کرنے کے لیے صلح کی بات چیت شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ان پر یلغار کا وقت ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت کٹوے میں فتح کا جشن منایا جا رہا ہوگا۔ انعامات اور خلعتیں تقسیم ہو رہی ہوں گی۔ اور مرہٹے چند میل دور اپنے پڑاؤ میں کسی نئے محاذ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ پھر رسد کا سامان پہنچے گا۔ سپاہی اور افسر چند دن خوشیاں منائیں گے۔ پھر جنگ کی تیاری ہوگی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پنڈت بھاسکر نے صلح کی بات چیت شروع کر دی ہو اور جس دن یہ بات چیت ختم ہو۔ علی وردی خاں کو یہ اطلاع ملے کہ مرہٹوں کی فوج کا ایک حصہ کٹوے سے پچاس یا سو کوس دور ہمارے کسی اور علاقے یا شہر میں لوٹ مار شروع کر چکا ہے۔ مجھے علی وردی خان کی سپاہیانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔ لیکن میں ایک حکمران کی سیاسی مصلحتوں سے ڈرتا ہوں۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو آج بنگال کی فوجیں کٹوے سے کوسوں دور مرہٹوں کا تعاقب کر رہی ہوتیں۔ ان کے رسد اور بارود کے [illegible] اور ان کی توپیں ہمارے قبضے میں ہوتیں۔ پنڈت بھاسکر اگر صلح کے لیے ایلچی بھیجتا تو میں

یہ جواب دیتا کہ صلح کی بات چیت صرف بنگال کی سرحدوں سے باہر ہو سکتی ہے۔"

حسین بیگ نے کہا: "لیکن میر مدن، علی وردی خان کے ساتھ ہے اور تم ہمیشہ یہ کہا کرتے ہو کہ وہ ایک حقیقت پسند سپاہی ہے!"

معظم علی نے جواب دیا: "وہ یقیناً ہماری فوج کے تمام جرنیلوں سے زیادہ دور اندیش ہیں لیکن میدان جنگ سے باہر علی وردی کے نزدیک ایسے لوگوں کی اہمیت عام طور پر کم ہو جاتی ہے۔ دربار میں وہ میر جعفر اور دلب رام جیسے خوشامدیوں اور جی حضوریوں کی باتیں زیادہ غور سے سنتے ہیں۔"

حسین بیگ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا: "ہاں معظم آج صبح چند آدمی بندوقیں واپس کرنے آئے تھے۔ لیکن میں نے انھیں یہ کہا کہ جب تک فوج واپس نہیں آتی یہ تمھارے پاس امانت رہیں گی۔ تم بھی یہی چاہتے تھے نا؟"

"جی ہاں۔"

"لیکن اب تمھارے رضاکار پریڈ کے لیے آنا تو شاید پسند نہ کریں!"

"پریڈ کی اب ضرورت نہیں وہ ابتدائی تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ اب صرف رات کے وقت محلے میں پہرہ دینے کی ضرورت ہے۔ فتح کی خبر سننے کے بعد ایسی باتوں سے لوگوں کی دلچسپی ذرا کم ہو گئی ہے۔ لیکن دو چار دنوں کے بعد وہ پھر سنجیدگی کے ساتھ میری باتیں سننے لگ جائیں گے۔"

* * *

شام کے وقت بارش ہو رہی تھی۔ مرشد آباد کے قائم مقام فوجدار کے ہاں شہر کے چند روسا اور سرکاری عہدہ داروں کی دعوت تھی۔ جب مہمان ایک کشادہ کمرے میں دسترخوان پر بیٹھ گئے تو کسی نے فوجدار سے مرزا حسین بیگ کی غیر حاضری کی وجہ دریافت کی۔

فوجدار نے جواب دیا: "ان کا پیغام آیا ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔"

ایک شخص نے کہا "جناب مرزا صاحب آجکل یوں بھی اپنی حویلی سے باہر نہیں نکلتے"۔

دوسرا بولا: "بھئی جب گھر میں کام ہو تو باہر نکلنے کی کیا ضرورت ہے۔ مرزا صاحب آجکل بہت مصروف ہیں۔ آپ ان کی حویلی کے اندر جا کر دیکھیں تو حیران رہ جائیں"۔

ایک اور آدمی فوجدار سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جناب اگر آپ مرزا صاحب کو یہ یقین دلاتے کہ اب مرشد آباد کو کوئی خطرہ نہیں تو وہ ضرور تشریف لاتے"!

فوجدار نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس کے مہمان اپنی اپنی بساط کے مطابق مرزا حسین بیگ پر پھبتیاں کس رہے تھے۔

شہر کے ایک تاجر نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ وہ اپنے محلے کے لوگوں کو رات بھر سونے نہیں دیتے"۔

مرشد آباد کا کوتوال بولا: "مرزا صاحب ایک سیدھے سادے بزرگ ہیں۔ لیکن ان کے محلّے کا ایک نوجوان ان کے ساتھ دل لگی کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں میں ان کے محلّے سے گزر رہا تھا۔ بانس سے بھرے ہوئے کئی چھکڑے ان کی حویلی کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ مرزا صاحب اندر مورچے بنوا رہے ہیں"۔

"بانس کے مورچے؟" ایک امیرزادے نے کہا: "آپ کے ساتھ کسی نے مذاق کیا ہوگا"؟

"جی نہیں، آپ مرزا صاحب کی حویلی دیکھیں تو حیران رہ جائیں گے"۔

تھوڑی دیر بعد حسین بیگ اس محفل کی گفتگو کا واحد موضوع بن چکا تھا۔ اور قریباً ہر شخص اس گفتگو میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ فوجدار ایک سنجیدہ آدمی تھا اور اسے یہ باتیں ناگوار محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ لیکن جب مہمان زیادہ بے تکلف ہو کر حسین بیگ کا مذاق اڑانے لگے تو اس نے کہا: "مرزا صاحب ہمارے بزرگ ہیں اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اس محفل میں انھیں موضوعِ بحث بنایا جائے"۔

ایک عمر رسیدہ آدمی نے کہا: "جناب مرزا صاحب کا ہم سب احترام کرتے ہیں لیکن بانس

سے مورچے تعمیر کرنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بھلا بانس گولی روک سکتے ہیں؟"

فوجدار نے جواب دیا: "بانس گولی نہیں روک سکتے لیکن گولی چلانے والوں کو آگے بڑھنے سے روک سکتے ہیں۔ میں نے خود مرزا صاحب کی حویلی کے دفاعی انتظامات دیکھے ہیں۔ اور وہاں مجھے کوئی بات مضحکہ خیز نظر نہیں آئی۔ ان کا محلہ شہر سے باہر ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ خطرے کے وقت اس محلّے کے لوگ شہر کے لوگوں کی نسبت کم محفوظ نہیں ہوں گے"۔

ایک نوکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا فوجدار کے قریب پہنچا اور اس نے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔

فوجدار نے دسترخوان سے اٹھتے ہوئے مہمانوں کی طرف دیکھا اور کہا!

"آپ اطمینان سے کھانا کھائیں، میں ابھی آتا ہوں"۔

فوجدار کمرے سے باہر نکلا تو برآمدے میں ایک فوجی افسر کھڑا تھا۔ اس نے سلام کے بعد کہا، "جناب معاف کیجیے میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی ہے لیکن خبر بہت تشویشناک ہے۔ مرہٹوں کی ایک فوج یلغار کرتی ہوئی مرشد آباد کی طرف بڑھ رہی ہے!"

فوجدار نے اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے کہا: "یہ خبر کون لایا ہے؟"

"ابھی راستے کی ایک چوکی کا کمانڈر یہاں پہنچا ہے اور وہ یہ کہتا ہے پچھلی چوکیوں کے سپاہیوں نے ڈاک گھوڑوں پر یہ خبر اس تک پہنچائی تھی۔ میں نے تصدیق کے لیے سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کر دیا ہے۔"

"اور خبر لانے والا کہاں ہے؟"

"جی میں اسے محل کے ناظم کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ وہ تھکاوٹ سے نڈھال تھا۔ اس نے صبح سے لے کر شام تک لگاتار سفر کیا ہے اور راستے میں کئی گھوڑے تبدیل کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب میں اپنی چوکی سے روانہ ہوا تھا۔ تو مرہٹے صرف ایک منزل پیچھے تھے۔ اور اب یہاں سے شاید دو یا تین منزل دور ہوں گے"۔

" اچھا میں ابھی آتا ہوں۔ تم جاکر شہر میں منادی کرا دو!"

افسر نے سلام کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

فوجدار دوبارہ مہمانوں کے کمرے میں داخل ہوا۔

کسی نے سوال کیا "جناب کیا بات تھی؟"

فوجدار نے دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے کہا: "کچھ نہیں۔ ایک سرکاری کام تھا۔ آپ اطمینان سے کھانا کھائیں۔"

لیکن مہمان کھانے سے زیادہ فوجدار کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کر رہے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر فوجدار دسترخوان سے اٹھا اور اس نے کہا: "حضرات مجھے کچھ کام ہے اس لیے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ لیکن آپ آرام سے باتیں کریں۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔"

ایک امیرزادے نے سوال کیا: "آپ اس بارش میں کہاں جا رہے ہیں؟"

فوجدار نے جواب دیا: "ایک سپاہی کو بارش میں چلنے کا عادی بننا پڑتا ہے۔ مجھے ابھی خبر ملی ہے کہ مرہٹوں کا لشکر مرشدآباد کا رخ کر رہا ہے۔"

مجلس پر سناٹا چھا گیا اور حاضرین بدحواس ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

فوجدار نے کہا: "لیکن پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ وہ ابھی یہاں سے کئی منزل دور ہیں۔ اگر انھوں نے انتہائی کوشش کی تو بھی کل صبح یا دوپہر سے پہلے یہاں نہیں پہنچیں گے۔"

فوجدار باہر نکل گیا۔

چند ثانیے بعد معزز مہمانوں کی افراتفری کا یہ عالم تھا کہ ان کے لیے اپنے جوتے پہچاننا بھی مشکل تھا۔ کوئی اپنے جوتوں کی بجائے کسی اور کے جوتے پہننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی بدحواسی کی حالت میں دائیں پاؤں کے جوتے میں بایاں اور بائیں پاؤں کے جوتے میں دایاں پاؤں ڈال رہا تھا، پھر مکان سے نکلنے کے بعد ان میں سے اکثر برسوں کے بعد پہلی بار بھاگنے کی مشق کر رہے تھے۔

* * *

تھوڑی دیر بعد مُرشدآباد کے ہر گلی کوچے میں مرہٹوں کی پیشقدمی کی خبر مشہور ہو چکی تھی۔ مرزا حسین بیگ کے محلے کی عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان موسلا دھار بارش میں اس کی حویلی کا رخ کر رہے تھے۔ ایک ساعت کے اندر اندر رہائشی مکان کی نچلی منزل اور دیوان خانے کے کمروں اور برآمدوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ بعض لوگ افراتفری کے عالم میں بارش سے بچنے کے لیے چاردیواری سے باہر غلے اور چارے کے گوداموں، نوکروں کی کوٹھریوں اور گھوڑوں کے اصطبل میں پناہ لے رہے تھے۔

معظم علی محلے کی گلیوں کے ناکے دیکھنے اور پہرہ داروں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد پانی اور کیچڑ سے لت پت حویلی میں داخل ہوا۔ ڈیوڑھی کے اندر دو مشعلیں جل رہی تھیں اور حسین بیگ چند آدمیوں کے درمیان کھڑا تھا۔

معظم علی نے حسین بیگ کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا: "فوجدار کی طرف سے کوئی جواب آیا ہے؟"

"ہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ صبح سے پہلے مُرشدآباد پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں اور اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو اہل شہر کو خبردار کرنے کے لیے توپیں چلا دی جائیں گی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ مرہٹہ دستوں کی قیادت میر حبیب کر رہا ہے۔"

معظم علی نے کہا: "آپ اندر جاکر آرام کریں۔ میں گلیوں کے تمام ناکے دیکھ آیا ہوں۔ ہمارے انتظامات بہت تسلی بخش ہیں۔"

حسین بیگ نے کہا: "اگر آج رات اس گھر کی چاردیواری کے اندر کوئی آرام کر سکے تو میں یہ کہوں گا کہ وہ محشر کے دن بھی اطمینان کی نیند سو سکے گا۔ ذرا جاکر دیکھو، تمھیں یقین نہیں آئے گا کہ انسان اتنا شور مچا سکتے ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ روئے زمین کے تمام ہنگامے میرے گھر کی چاردیواری کے اندر جمع ہو گئے ہیں۔ ہر شخص اپنے پورے خاندان کو

ایک ہی کمرے کے اندر دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے مردوں کو عورتوں سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ ایک دروازے سے نکلتے ہیں اور دوسرے دروازے سے پھر وہیں پہنچ جاتے ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "چچا جان میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آدھ گھنٹے کے بعد آپ کسی کی آواز نہیں سنیں گے۔ آیئے میرے ساتھ!"

حسین بیگ نے کہا: "نہیں میں آدھ گھنٹے کے لیے اندر جانے کی بجائے ساری رات یہاں کھڑا رہنا آسان سمجھتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اندر جا کر کسی کا گلا گھونٹ دوں گا۔"

معظم علی نے ڈیوڑھی میں جمع ہونے والے مسلح رضاکاروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا:۔

"تم دروازہ بند کر دو اور میرے ساتھ آؤ!"

رضاکاروں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ معظم علی موسلا دھار بارش میں حویلی کے اندرونی صحن کی طرف بڑھا۔ حسین بیگ کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر بھاگتا ہوا ان کے ساتھ جا ملا۔ رہائشی مکان کے برآمدوں اور کمروں میں ایک طوفان حشر بپا تھا۔ حسین بیگ کے نوکر جگہ جگہ مشعلیں لیے کھڑے تھے۔

معظم علی برآمدے میں داخل ہوا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے چلایا۔ "خاموش! خاموش!!"

برآمدے میں اس کے پاس چند لوگ خاموش ہو گئے لیکن مکان کے باقی حصوں میں چیختے چلاتے انسانوں کے ہجوم کو اس کی آواز متاثر نہ کر سکی۔

معظم علی نے حسین بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "آپ اوپر جا کر دیکھیں اگر بالائی منزل میں جگہ ہے تو عورتوں اور بچوں کو وہاں بھیج دیا جائے۔"

حسین بیگ نے جواب دیا۔ "بالائی منزل پر عورتوں اور بچوں کے لیے کافی جگہ ہے لیکن مردوں کی بدتمیزی دیکھ کر میں نے سیڑھی کے دروازے پر تالا لگا دیا تھا۔ وہ عورتوں اور بچوں سے پہلے وہاں پہنچنا چاہتے تھے۔"

"آپ تالا کھول دیں۔ میں انھیں سمجھاؤں گا۔"

"تم پہلے تسلی کر لو ورنہ یہ دروازہ کھلتے ہی بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح اوپر بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ خدا کے لیے انھیں خاموش کرو۔ ورنہ میں واقعی کسی کا سر پھوڑ ڈالوں گا۔"

"یہ ابھی خاموش ہو جائیں گے۔"

معظم علی نے ایک رضاکار کے ہاتھ سے بندوق لی اور صحن کی طرف منہ کر کے ہوا میں فائر کر دیا۔

ایک ثانیہ کے اندر اندر کے ہر گوشے میں سناٹا چھا گیا۔ معظم علی نے لوگوں کی بدحواسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلند آواز میں کہا:۔

"بھائیو اور بہنو! ابھی دشمن کئی میل دور ہے اور صبح تک مرشد آباد پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں۔ ہم نے تمھاری حفاظت کا پورا انتظام کر رکھا ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر تمھاری افراتفری کا یہی عالم رہا تو تمھارے محافظوں کے لیے یہ چیخ پکار اور یہ بدنظمی دشمن کی گولیوں کی نسبت زیادہ خطرناک ثابت ہو گی۔ میں تمھیں چند ضروری ہدایات دینا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر کسی نے میری ہدایات کی خلاف ورزی کی تو اسکی حفاظت ہمارے ذمے نہیں ہو گی۔ ہم اسے اس حویلی سے باہر نکال دیں گے۔

میری ہدایات یہ ہیں:۔ وہ تمام آدمی جن کی عمر پچاس سال سے کم ہے۔ فوراً باہر نکل آئیں انھیں بیرونی صحن کی کوٹھریوں میں جگہ دی جائے گی۔ خواتین جن کے ساتھ کم سن بچے ہیں بالائی منزل کے کمروں میں چلی جائیں۔ بڑی عمر کے لڑکے اور عمر رسیدہ یا بیمار لوگ دیوان خانے کے کمروں اور برآمدوں میں پناہ لے سکتے ہیں۔ جن خواتین کو بالائی منزل کے کمروں میں جگہ نہ مل سکے وہ نچلی منزل کے باقی کمروں میں رہیں۔

حملے کے وقت جو لوگ لڑنے کے قابل ہوں اور جن کے پاس کوئی ہتھیار ہو وہ رضاکاروں کیساتھ شامل ہو جائیں اور باقی یہاں آ جائیں۔ اگر بارش تھم گئی تو وہ اندرونی صحن کے مورچوں میں پناہ لے سکیں گے۔ ورنہ برآمدوں اور نچلی منزل کے کمروں میں ان کے لیے کافی جگہ ہو گی۔ دس منٹ کے بعد میں مکان کے تمام کمروں کا معائنہ کروں گا۔ اگر مجھے معلوم ہوا کہ کسی نے جان بوجھ کر

میری ہدایات پر عمل نہیں کیا تو اسے کسی اچھے سلوک کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔ آدھ گھنٹے کے بعد تمام مشعلیں بجھادی جائیں گی۔ میں آپ کی تسلّی کے لیے پھر ایک بار یہ اعلان کرتا ہوں کہ صبح تک حملے کا کوئی خطرہ نہیں۔ آپ اپنی جگہ آرام سے لیٹے رہیں۔ اس وقت ہماری ساری توجّہ حویلی کے دفاعی انتظامات پر صرف ہونی چاہیئے۔ اور میں یہ امید رکھتا ہوں کہ آپ بلاوجہ ہمیں پریشان نہیں کریں گے۔"

قریباً پون گھنٹہ کے بعد حویلی میں مکمل سکون تھا اور معظّم علی حسین بیگ سے کہہ رہا تھا "چچا جان! اب آپ اوپر جا کر اپنے کمرے میں آرام کریں۔"

حسین بیگ نے جواب دیا: "بیٹا میں صرف شور سے گھبراتا تھا۔ اب مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔ میں رضاکاروں کے ساتھ باہر کی فصیل پر پہرہ دینا چاہتا ہوں۔"

* * *

اگلے دن دس بجے کے قریب میر حبیب کی قیادت میں مرہٹوں کا لشکر مرشد آباد کے مضافات میں لوٹ مار کر رہا تھا۔ حملہ آور فوج کے ایک دستے نے حسین بیگ کے محلے میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن گلی کے مورچوں سے گولیوں کی بوچھاڑ نے انھیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد چند اور دستے آ گئے اور انھوں نے ایک گلی کے ناکے کے آس پاس چند مکانات کی چھتوں پر قبضہ کر کے رضاکاروں کو پیچھے ہٹا دیا اور محلے کے اندر داخل ہو گئے۔ محلے کی گلیاں اور مکانات خالی دیکھنے کے بعد انھوں نے حسین بیگ کی حویلی کی طرف توجہ کی اور ڈیوڑھی کے دروازے پر حملہ کر دیا۔ اچانک ڈیوڑھی کی چھت اور فصیل کے مورچوں سے گولیاں برسنے لگیں اور وہ گلی میں چند لاشیں چھوڑ کر آس پاس کے مکانات میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس عرصہ میں مرہٹوں کے ایک اور دستے نے دوسری طرف سے فصیل کے ایک حصّہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن حویلی کے محافظوں نے اسے بھی مار کر پیچھے ہٹا دیا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ وہ آس پاس کے مکانات کی چھتوں پر لیٹ کر گولیاں چلاتے رہے۔

اتنی دیر میں ان کے کئی اور ساتھی اس محلے میں جمع ہو چکے تھے۔ مرہٹوں نے اچانک مشرقی سمت میں حویلی کے قریب ایک دو منزلہ مکان کی چھت سے فائر شروع کیے تو اس طرف فصیل کے محافظ ان کی گولیوں کی زد میں تھے۔ چند رضاکار زخمی ہوئے اور باقی بلندی سے آنے والی گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے اپنے مورچوں میں دبک گئے۔ مرہٹوں کے چند دستوں نے اس صورتحالات سے فائدہ اٹھایا اور اچانک گلیوں اور مکانوں سے نکل کر فصیل کے اس حصّے پر دھاوا بول دیا۔ ان کے چند آدمیوں نے فصیل کے ساتھ بانس کی سیڑھیاں کھڑی کر دیں اور آن کی آن میں کوئی پچاس آدمی فصیل پر پہنچ گئے۔ فصیل کے محافظ آس پاس کے مورچوں سے نکل کر اس طرف بڑھے۔ لیکن مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ چند منٹ دست بدست لڑائی کے بعد مرہٹے فصیل کے مشرقی حصّہ پر قابض ہو چکے تھے اور حویلی کے محافظ صحن میں جمع ہو کر انھیں نیچے اترنے سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

معظّم علی ڈیوڑھی کی چھت پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے ایک رضاکار سے کہا "پسپائی کے لیے نقارہ بجا دو۔"

رضاکار نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور بیرونی فصیل کے محافظ نقارے کی آواز سنتے ہی اپنے اپنے مورچے چھوڑ کر اندرونی صحن کے دروازے کی طرف بھاگنے لگے۔ مشرقی دیوار کے نیچے لڑنے والے رضاکاروں کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر مرہٹے انھیں گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ معظّم علی جلدی سے نیچے اترا اور آٹھ دس نوجوانوں کے ساتھ مرہٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس حملے کی شدت نے مرہٹوں کو چند قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور رضاکار ایک منظم طریقے سے پسپا ہونے لگے۔

مرہٹوں نے اپنی فتح یقینی سمجھ کر چند آدمیوں کے بچ نکلنے کو زیادہ اہمیت نہ دی اور انھوں نے آگے بڑھ کر ڈیوڑھی کا دروازہ کھول دیا۔ قریباً آٹھ سو مرہٹے سیلاب کے ریلے کی طرح بیرونی صحن میں داخل ہوئے۔ لیکن اس عرصہ میں اندرونی اور بیرونی چار دیواری کے درمیان کا وسیع

احاطہ حویلی کے محافظوں سے خالی ہو چکا تھا۔ مرہٹہ لشکر کا ایک سردار چلایا "بہادرو! ہمارے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ دیوار پھاند کر اندر داخل ہو جاؤ!"

سپاہیوں نے کسی توقف کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن چند ثانیے بعد وہ اپنے ساتھیوں کو خندق میں گرتا دیکھ کر انتہائی بدحواسی کی حالت میں چلا رہا تھا "یہ مکان نہیں قلعہ ہے۔ ہم نے مفت میں اتنی جانیں گنوائی ہیں۔ دروازے کی طرف بڑھو!"

اندرونی صحن کا دروازہ مرہٹوں کے بے پناہ ہجوم نے ایک ہی دھکے میں توڑ دیا — وہ فتح کے نعرے لگاتے ہوئے ایک میلے کی بھیڑ کی طرح آگے بڑھے۔ اندرونی دروازے اور رہائشی مکان کے درمیان کشادہ صحن کے وسط میں نصف دائرے کی شکل میں ایک کھائی تھی۔ جس کے دونوں سرے خندق سے ملے ہوئے تھے۔ اس کھائی کے اندر ساٹھ رضاکار اپنے نو عمر سالار کی آواز کے منتظر تھے۔ کھائی کے پیچھے دو چھوٹے چھوٹے خیموں کے اندر توپیں نصب تھیں جن کا رُخ دروازے کی طرف تھا۔

حملہ آور لشکر کا سردار کھائی سے چند قدم کے فاصلے پر دونوں ہاتھ بلند کر کے چلایا "ٹھہرو!" اور مرہٹوں کا ہجوم رک گیا۔

مرہٹہ سردار نے قدرے توقف کے بعد کہا "اب مقابلے سے کوئی فائدہ نہیں تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ ہتھیار پھینک کر مورچوں سے باہر نکل آؤ، ورنہ ہم ایک آدمی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس محلے کے تمام لوگ اس مکان میں جمع ہیں۔ اگر تم اپنی عورتوں کی عزت اور بچوں کی جانیں بچانا چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال دو۔ ورنہ . . . . !"

سالار اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ مکان کی چھت سے بندوق چلنے کی آواز آئی اور وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی صحن اور برآمدوں کے مورچوں، مکان کی چھت اور کھڑکیوں سے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ مرہٹے طیش میں آ کر چند قدم آگے بڑھے اور پھر الٹے پاؤں دروازے کی طرف بھاگنے لگے۔ اچانک یکے بعد دیگرے توپوں کے دو خوفناک دھماکے سنائی دیئے اور

لوہے کے بے شمار ٹکڑوں نے دروازے کے سامنے کئی گز تک لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

اس کے بعد حملہ آور ایک ٹوٹے ہوئے دروازے کو ہزاروں خندقوں اور کھائیوں سے زیادہ خطرناک سمجھ کر درمیانی دیوار کی اوٹ میں پناہ لے رہے تھے۔ ان کے سو سے زیادہ آدمی ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے۔ قریباً دو گھنٹے اور گزر گئے اور حویلی کے محافظوں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ٹوٹے ہوئے دروازے کے قریب دیوار کے عقب سے سفید جھنڈا نمودار ہوا۔ اور کسی نے بلند آواز میں کہا:

"ہم صلح کی بات چیت کے لیے ایک آدمی اندر بھیجنا چاہتے ہیں!"

جب چند ثانیے اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو کسی نے دوبارہ کہا "ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ صلح کی بات چیت کے لیے ہمارا ایک آدمی اندر آ سکتا ہے یا نہیں؟"

معظم علی صحن کے مورچے سے نکل کر چند قدم آگے بڑھا اور اس نے جواب دیا "تم ایک آدمی اندر بھیج سکتے ہو۔"

مرہٹہ فوج کا ایک افسر سفید جھنڈا اٹھائے دروازے کے سامنے نمودار ہوا اور راستے میں بکھری ہوئی لاشوں سے بچ بچ کر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ معظم علی سے چند قدم کے فاصلے پر رکا اور بولا "ہمیں تمھاری تیاری کا علم نہ تھا اور ہم نے اپنی غلطی سے اتنا نقصان اٹھایا ہے لیکن تمھیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم اتنا نقصان اٹھانے کے بعد خالی ہاتھ واپس چلے جائیں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا "ہمیں اس سے زیادہ کسی بات کی خواہش نہیں کہ تم میں سے کوئی واپس نہ جا سکے۔"

مرہٹہ افسر نے کہا "میں اس حویلی کے مالک کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں!"

معظم علی نے جواب دیا "اس حویلی کا مالک ڈاکوؤں کے ساتھ بات کرنے کا عادی نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم ایک لاکھ روپے کے عوض اپنی جانیں بچا سکتے ہو۔"

"تم نے ہماری جانوں کی قیمت بہت کم لگائی ہے۔ اور ہمارے پاس روپوں کی بجائے گولیاں ہیں۔"

"اچھی طرح سوچ لو!"

"تم جا سکتے ہو۔"

مرہٹہ افسر نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "تم نے ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہے، ہمارا لشکر شہر کے دوسرے محلوں میں مصروف ہے۔ لیکن اگر ضرورت پڑی تو ہم ان سب کو یہاں لے آئیں گے۔"

"یہ جگہ کافی کشادہ ہے اور یہاں تمہارے تمام لشکر کی لاشیں سما سکتی ہیں۔ اور شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ہماری فوج تمہارے پیچھے آ رہی ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے لیکن جب وہ یہاں پہنچیں گے تو ان کے سامنے صرف تمہاری قبریں کھودنے کا کام ہوگا۔ ہم تمہیں آخری بار سوچنے کا موقع دیتے ہیں۔ اس کے بعد تم مرشد آباد کے تمام خزانے ہمارے قدموں میں ڈھیر کرو گے تو بھی تمہاری بات نہیں سنی جائے گی۔"

"تم ایک لاکھ روپیہ مانگتے ہو۔ لیکن ہمارے پاس تمہارے لیے صرف گولیاں ہیں۔ تم جا سکتے ہو۔ ہم تمہارے حملے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"اچھا تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

مرہٹہ افسر یہ کہہ کر مڑا اور سفید جھنڈا زمین پر پھینک کر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر میں مرہٹوں نے آس پاس کے چند اونچے مکانات کی چھتوں سے فائرنگ شروع کر دی اور معظم علی کے ساتھی اس کے جواب میں حویلی کے رہائشی مکان کی چھت سے گولیاں برسانے لگے۔ غروب آفتاب تک بندوقوں کی یہ لڑائی جاری رہی۔ اس کے بعد مرہٹوں نے فائرنگ بند کر دی۔ ان کے بیشتر آدمی ابھی تک حویلی کے بیرونی احاطے میں جمع تھے۔ شام

ہوتے ہی ان کے ساتھ چند اور دستے آ ملے۔ معظّم علی کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ نئے حملے کے لیے رات کی تاریکی کا انتظار کر رہے ہیں۔ اندرونی دیوار کے پیچھے مرہٹوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے اس نے خندق کے ساتھ ساتھ ایک چکر لگایا۔ شمالی دیوار کے قریب پہنچ کر اسے کچھ آہٹ سنائی دی اور اس نے محسوس کیا کہ مرہٹے دیوار کے پیچھے زمین کھودنے میں مصروف ہیں۔ مشرقی دیوار کے قریب پہنچ کر بھی اس نے یہ محسوس کیا کہ دیوار کے ساتھ ساتھ زمین کھودی جا رہی ہے۔ شام کے دھندلکے میں وہ شمالی اور مشرقی دیوار کے ایک کونے میں آم کے ایک بلند درخت پر چڑھا۔ چوٹی پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ سینکڑوں آدمی دیوار کے ساتھ ساتھ زمین کھودنے میں مصروف ہیں۔ اس نے جلدی سے نیچے اتر کر تمام مورچوں کا چکر لگایا اور رضاکاروں کو خبردار کیا کہ دشمن شمال اور مشرق کی دیواریں گرانے کے بعد ایک فیصلہ کن حملہ کرنا چاہتا ہے، پھر وہ نچلی منزل میں جمع ہونے والے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اور انھیں ہدایت کی کہ اب یہاں کسی عورت، بچے یا بیکار آدمی کو نہیں رہنا چاہیئے۔ وہ جن کے لیے بالائی منزل کے کمروں میں جگہ نہیں، چھت پر چلے جائیں۔ اگر مرہٹے یہاں تک آ گئے تو تم میں سے ہر ایک کو اپنی بہنوں کے ناموس کی خاطر لڑنا پڑے گا۔ تھوڑی دیر بعد رضاکار مشرقی اور شمالی دیوار کے سامنے ریت کی بوریوں کے نئے مورچے بنا رہے تھے۔

کوئی دس بجے کے قریب مرہٹوں نے جنوب اور مغرب کی سمت باہر کے مکانات کی چھتوں سے دوبارہ فائرنگ شروع کی۔ معظّم علی نے بھاگ کر میدان کے اندر اور باہر تمام مورچوں کا چکر لگایا اور رضاکاروں کو یہ حکم دیا کہ دشمن شمال اور مشرق کی طرف سے حملہ کرنے سے پہلے تمہاری توجہ دوسری طرف مبذول کرنا چاہتا ہے تم اس فائرنگ کی پروا نہ کرو۔ مکان کی چھت سے چند آدمی دشمن کی گولیوں کا جواب دیتے رہیں گے لیکن باقی سب کی توجہ اس طرف رہنی چاہیئے۔

رات کے گیارہ بجے کے قریب یکے بعد دیگرے چند دھماکے سنائی دیئے۔ اور شمال اور مشرق کی دیواریں جن کی بنیادیں کھودی جا چکی تھیں۔ کئی جگہ سے گر پڑیں۔ دیواروں میں شگاف

پڑنے کی دیر تھی کہ مرہٹوں نے پوری شدت کے ساتھ حملہ کر دیا۔ اندر سے بھی گولیوں کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ لیکن حملہ آور تاریکی سے فائدہ اٹھا کر خندق عبور کرنے کے بعد بانس کی باڑ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ شدید نقصان اٹھانے کے بعد صحن کے اندر اِدھر اُدھر پھیل گئے اور زمین پر رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اس دوران میں مرہٹوں کی فوج کے ایک حصّہ نے براہ راست دروازے سے صحن پر یلغار کرنے کی کوشش کی لیکن رضا کاروں نے انھیں صحن کے درمیانی مورچوں کے قریب نہ آنے دیا۔ توپوں سے پھر ایک بار کام لیا گیا اور مرہٹے بھاری، نقصان اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد لڑائی کا سارا زور شمال اور مشرق کی طرف تھا۔ حملہ آوروں کے لیے رات کی تاریکی جس قدر فائدہ مند تھی اسی قدر نقصان دہ بھی تھی۔ وہ دیواریں توڑنے کے بعد اچانک حملہ کر کے حویلی کے محافظوں کی سراسیمگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ لیکن رضا کاروں کی غیر متوقع مدافعت نے ان کے حوصلے پست کر دیئے۔ تاریکی میں انھیں اپنے زخمی اور ہلاک ہونے والے ساتھیوں کی صحیح تعداد کا علم نہ تھا۔ تاہم گولیوں کی بوچھاڑ میں زخمی ہونے والوں کی چیخیں ہر آن اُن کی سراسیمگی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ چند آدمی راستے کے مورچے توڑنے کے بعد مکان کے قریب پہنچ گئے لیکن تلواروں، خنجروں اور لاٹھیوں سے مسلح آدمیوں کا ہجوم کمروں اور برآمدوں سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ چند مرہٹے مارے گئے اور باقی پیچھے ہٹ گئے۔

تھوڑی دیر بعد چند حملہ آور مکان پر یلغار کرنے کی بجائے صحن کے درختوں کی آڑ لے کر اور باقی گری ہوئی دیواروں کے پیچھے چھپ کر فائر کرنے پر اکتفا کر رہے تھے۔

◆

آدھی رات کو جب چاند نمودار ہو رہا تھا۔ شہر کے مختلف گوشوں سے نقاروں کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور مرہٹے ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف سمٹنے لگے۔ حویلی کے محافظ بندوقوں کے دھماکوں کی بجائے بھاگتے ہوئے دشمن کے پاؤں کی آہٹ سن رہے تھے۔

معظم علی نے برآمدے کے سامنے ایک مورچے سے باہر نکل کر بلند آواز میں کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ دشمن شہر خالی کر رہا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ایک چال ہو۔ تم اپنے مورچوں میں چوکس رہو اور میری ہدایات کا انتظار کرو۔ میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں۔"

معظم علی تاریکی میں احتیاط سے پاؤں اٹھاتا ہوا زینے کی طرف بڑھا۔ زینے پر پاؤں رکھتے ہی اسے کسی کی آواز سنائی دی: "کون ہے؟"

"میں ہوں چچا جان!" معظم علی نے حسین بیگ کی آواز پہچان کر جواب دیا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مرہٹوں نے اچانک گولہ باری کیوں بند کر دی ہے؟"

"میرے خیال میں وہ واپس جا رہے ہیں۔ اور اب حملے کا کوئی خطرہ نہیں لیکن میں ذرا چھت پر جا کر تسلی کروں۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

معظم علی کسی توقف کے بغیر زینے پر چڑھنے لگا۔ چھت پر پاؤں رکھتے ہی اسے ایک کونے سے بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ چھت پر حسین بیگ کے اپنے نوکروں کا پہرا تھا اور وہ معظم علی کی ہدایات کے مطابق منڈیر کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک چھت کے کونے میں کھڑا اطمینان سے اپنی بندوق بھر رہا تھا۔ معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے غضبناک ہو کر کہا: "بیوقوف اپنا سر نیچے رکھو!"

لیکن اس نے معظم علی کی طرف توجہ نہ دی۔ اس کے ہاتھ بندوق بھرنے میں مصروف تھے اور نگاہیں صحن میں آم کے ایک درخت پر لگی ہوئی تھیں۔ معظم علی کو کسی رضا کار یا حسین بیگ کے نوکر سے حکم عدولی کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ بندوق کا دھماکہ سنائی دیا اور گولی سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ معظم علی جلدی سے دبک کر منڈیر کی آڑ میں بیٹھ گیا۔

چند ثانیے اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر اسے ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔ "آپ ٹھیک ہیں نا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن خودکشی کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تم گولی کا انتظار کرنے کی بجائے آنکھیں بند کر کے نیچے چھلانگ لگا دو۔" یہ کہہ کر معظم علی نے جلدی سے گھٹنوں کے بل آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے کھینچ کر نیچے بٹھا دیا۔

"یہ گولی سامنے کسی درخت سے آئی تھی؟" معظم علی نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"تم کون ہو؟"

اپنے سوال کا کوئی جواب نہ پا کر معظم علی نے کہا۔ "تم ذرا نیچے چلی جاؤ۔ لڑکیوں کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔"

اس نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور گھٹنوں کے بل ہو کر صحن کی طرف جھانکنے کے بعد اچانک ایک فائر کر دیا۔

معظم علی نے گردن اوپر کر کے صحن کی طرف دیکھنے کے بعد کہا۔ "تم ہوا میں فائر کر رہی ہو اور دیکھو گردن نیچے رکھو!"

لڑکی نے کہا۔ "اگر آپ مداخلت نہ کرتے تو میرا نشانہ خالی نہ جاتا۔ اب وہ دوسری شاخ پر جا چکا ہے۔ یہ میری بندوق بھر دیجیے اور مجھے اپنی بندوق دیجیے۔ جلدی کیجیے وہ نیچے اترنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"یہ لو۔" معظم علی نے اپنی بندوق آگے بڑھاتے کہا۔ "تم اسے دیکھ سکتی ہو؟"

"ہاں۔" لڑکی نے اٹھ کر نشانہ باندھتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے اپنا سر نیچے رکھو۔" معظم علی نے جھنجھلا کر کہا۔

"میں آخری بار آپ کی حکم عدولی کر رہی ہوں۔" لڑکی نے یہ کہہ کر بندوق چلا دی۔ صحن میں آم کے درخت سے کسی بھاری شے کے گرنے کی آواز آئی۔

معظم علی نے کہا۔ "اب تمھاری ضد پوری ہو چکی ہے۔ لیکن ایک مرہٹے کے لیے تمھیں اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالنی چاہیے تھی۔"

"وہاں ایک نہیں تھا۔ میں نے اپنے کمرے کے دریچے سے چار آدمی درخت پر چڑھتے دیکھے تھے۔ ایک کو میں نے وہیں سے فائر کر کے گرا لیا تھا۔ دو بھاگ گئے تھے۔ اور یہ چوتھا کمرے کے دریچے سے میرے نشانے کی زد میں نہیں آتا تھا۔ اس لیے مجھے اوپر آنا پڑا۔"

معظم علی نے چاند کی روشنی میں پہلی بار غور سے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے سر پر سفید پگڑی تھی اور گلے میں بارود کا تھیلا لٹک رہا تھا۔ معظم علی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

معظم علی نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تم فرحت ہو؟"

لڑکی نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "آپ نے مجھے گالیاں دی ہیں۔"

"مجھے کسی سپاہی سے حکم عدولی کی توقع نہ تھی۔ اور تمھیں بلا وجہ جان خطرہ میں ڈالنے سے منع کرنا میرا فرض تھا۔ لیکن اگر تم خفا ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

"میں آپ سے خفا نہیں ہوں۔"

معظم علی نے کہا۔ "اب تم اطمینان سے نیچے جا کر سو جاؤ، اب حملے کا کوئی خطرہ نہیں، مرہٹے پسپا ہو رہے ہیں۔ گلی سے ان کے بھاگنے کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔"

چھت کے پہریدار اٹھ اٹھ کر صحن کی طرف جھانکنے اور ایک دوسرے کو یہ خوشخبری سنانے لگے۔ "مرہٹے بھاگ رہے ہیں۔ مرہٹے بھاگ رہے ہیں!"

معظم علی نے بھری ہوئی بندوق فرحت کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنی بندوق واپس لے لی اور کہا۔ "اب شاید آپ کو اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔"

فرحت کچھ کہے بغیر زینے کی طرف چل دی اور معظم علی نے رضاکاروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "تم بہت غیر ذمہ دار ہو۔ اگر مرزا صاحب کی صاحبزادی اپنی بے احتیاطی کے باعث زخمی ہو جاتیں تو ہم انھیں کیا منہ دکھاتے؟"

حسین بیگ کے ایک نوکر نے کہا: "جناب ان کے لباس سے دھوکا ہوا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ کوئی رضا کار ہے"۔

"لیکن کسی رضا کار کو بھی چھت پر کھڑا ہونے کی اجازت نہ تھی۔ تمھارا فرض تھا کہ تم انھیں بے احتیاطی سے منع کرتے!"

حسین بیگ کے نوکر نے جواب دیا: "ہم نے انھیں منع کیا تھا۔ لیکن انھوں نے ہماری طرف توجہ دینے کی بجائے اچانک بندوق چلا دی۔ اتنی دیر میں آپ پہنچ گئے"۔

معظم علی نے اٹھ کر چھت کی چاروں طرف متوجہ ہو کر کہا: "میرے خیال میں اب میدان خالی ہو چکا ہے۔ لیکن جب تک مجھے حویلی کے باہر کے حالات کے متعلق تسلی نہیں ہوتی تمھیں چوکس رہنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی تک چند آدمی درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے ہوں"۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی پندرہ رضا کاروں کے ساتھ اندرونی صحن کے طول و عرض میں چکر لگانے کے بعد باہر کے احاطے میں پہنچا۔ حملہ آور رفوچکر ہو چکے تھے۔ حویلی کے مختلف گوشوں میں دشمن کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور جگہ جگہ زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں، مرہٹے، حسین بیگ کے اصطبل سے بیس گھوڑے اپنے ساتھ لے جا چکے تھے۔

معظم علی رضا کاروں کے ساتھ حویلی سے باہر نکلا۔ قریباً ایک گھنٹہ محلے کی گلیوں میں چکر لگانے کے بعد اس نے واپس آ کر اعلان کیا: "مرہٹے جا چکے ہیں۔ خدا نے ہماری مدد کی ہے اب اس کی بارگاہ میں سجدوں کا وقت ہے"۔

عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان خوشی کے نعروں اور مسرت کے آنسوؤں سے اس کے اعلان کا خیر مقدم کر رہے تھے مکان کے اندر خواتین معظم علی کی ماں کے گرد جمع ہو کر تشکر اور احسان مندی کے جذبات کا اظہار کر رہی تھیں اور مکان سے باہر مردوں کا ہجوم معظم علی کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ وہ ان کے لیے ایک قابل فخر بیٹا، ایک قابل عزت بھائی اور ایک قابل اعتماد دوست بن چکا تھا۔

معظم علی نے رضا کاروں کو مشعلیں جلانے کا حکم دیا اور برآمدے کی سیڑھی پر کھڑا ہو کر بلند آواز میں کہا: "بھائیو! کمروں کے اندر خواتین اور بچے گرمی کے باعث سخت تکلیف میں ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اب تمام مرد حویلی کے بیرونی احاطے میں چلے جائیں تاکہ ہماری بہنیں باقی رات کھلی ہوا میں سانس لے سکیں۔ مسلح رضا کاروں کے لیے میرا یہ حکم ہے کہ وہ صبح تک بیرونی فصیل کے مورچوں میں پہرہ دیں۔ بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ مرہٹے دوبارہ حملہ کریں گے تاہم میں نے احتیاط کے طور پر چند آدمیوں کو باہر کے راستوں پر پہرہ دینے کے لیے بھیج دیا ہے۔ آپ کو رات کا کھانا نہیں ملا۔ مرزا صاحب نے اس بات کا ذمہ لیا ہے کہ دو گھنٹوں کے اندر اندر آپ سب کے لیے دسترخوان بچھا دیئے جائیں گے"۔

چوتھا باب

صبح کی نماز کے بعد محلے کے لوگ اپنے اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ معظم علی تھکاوٹ سے نڈھال ہو کر دیوان خانے کے برآمدے میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ دس بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو محمود علی، یوسف، حسین بیگ، آصف اور افضل اس کی چارپائی کے گرد کھڑے مسکرا رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر یکے بعد دیگرے اپنے باپ، بھائی، اور دوستوں سے بغل گیر ہوا۔

افضل نے کہا: "معظم تم نے تو ہمارے گھر کا نقشہ ہی بدل دیا ہے!"

حسین بیگ بولا: "بیٹا اگر مرہٹے ہمیں ایک دو ماہ اور مہلت دیتے تو معظم اس محلے کے ہر مکان کا نقشہ بدل دیتا۔"

محمود علی نے کہا: "ہم راستے میں بہت پریشان تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ ورنہ یہ محلہ بہت غیر محفوظ تھا۔"

حسین بیگ نے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ اب محلے کے لوگ میرا مذاق نہیں اڑائیں گے۔ ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر معظم کا قیاس غلط ثابت ہوا تو مجھے اس شہر سے ہجرت کرنا پڑے گی۔ سلطان خان نے میرا مذاق اڑانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ لیکن جب مرہٹوں کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ سارے شہر سے اپنی برادری کے لوگوں کو جمع کر کے یہاں آگیا تھا۔ رات کے وقت وہ میرے کتب خانے میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ لوگ تاریکی میں اسے ٹھوکریں مارتے

تھے۔ لیکن وہ اُف تک نہیں کرتا تھا۔"

معظم علی نے سوال کیا: "چچا جان! آپ نے شہر کے حالات معلوم کیے ہیں؟"

حسین بیگ نے جواب دیا: "شہر میں مرہٹوں نے کافی لوٹ مار کی ہے۔ جگت سیٹھ کے محل سے وہ بیس لاکھ روپیہ نکال کر لے گئے ہیں۔ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم شہیدوں کے جنازے کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اس کے بعد شام کے چار بجے تمھیں میر مدن کے پاس جانا ہے۔"

"میر مدن کے پاس؟"

"ہاں تم سو رہے تھے انھوں نے تمھیں جگانے کی اجازت نہیں دی۔"

"وہ یہاں آئے تھے؟"

"ہاں وہ آئے تھے اور حویلی کا معائنہ کرنے کے بعد واپس چلے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ فوج کے چند اور افسر بھی تھے۔ وہ تمھاری کارگزاری پر بہت خوش تھے۔"

معظم علی نے سوال کیا: "انھیں آپ نے یہاں بلایا تھا؟"

حسین بیگ نے جواب دیا: "بیٹا انھیں یہاں آنے کے لیے کسی کے بلانے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے لیے یہ خبر کافی تھی کہ اس حویلی میں دو سو مرہٹوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔"

محمود علی نے کہا: "راستے میں ہماری طرح میر مدن بھی اس محلے کے متعلق بہت پریشان تھے۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ مرزا صاحب کی حویلی بہت غیر محفوظ ہے۔ لیکن شہر میں داخل ہوتے ہی جب ہمیں مرہٹوں کے نقصانات کی اطلاع ملی تو انھوں نے کہا کہ میں سب سے پہلے مرزا صاحب کی حویلی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

* * *

شام کے چار بجے معظم علی شاہی محل کی چار دیواری کے اندر میر مدن کے مکان میں داخل ہوا۔ ایک سپاہی اسے ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں ایک نوجوان افسر کے پاس لے گیا۔

"تشریف رکھیے۔" افسر نے اپنے سامنے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

معظم علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "میرا نام معظم علی ہے اور مجھے میر صاحب نے بلایا ہے۔"

افسر چونک کر کرسی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "آپ محمود علی کے صاحبزادے ہیں؟ معاف کیجیے۔ میں آپ کو بڑی عمر کا آدمی سمجھتا تھا۔ میر صاحب چند افسروں سے بات کر رہے ہیں۔ آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔"

معظم علی افسر سے مصافحہ کرنے کے بعد دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند ثانیے خاموشی سے معظم علی کی طرف دیکھنے کے بعد افسر نے کہا:

"میرا نام گوہر خان ہے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

تھوڑی دیر بعد فوج کے چند افسروں کو دیوان خانے کے ایک کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر گوہر خان نے کہا:

"چلیے اب وہ فارغ ہوگئے ہیں۔"

معظم علی، گوہر خان کے پیچھے ہولیا۔ صحن عبور کرنے کے بعد وہ دیوان خانے کے برآمدے میں داخل ہوئے اور گوہر خاں معظم علی کو رکنے کا اشارہ کرکے اندر داخل ہوا۔ چند ثانیے بعد اس نے باہر نکل کر معظم علی کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔

سطوت و جبروت کا ایک پیکر مجسم کرسی سے اٹھ کر دو تین قدم آگے بڑھا اور معظم علی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمھیں انتظار کرنا پڑا۔ میں بہت مصروف تھا۔"

"مجھے آپ کی مصروفیت کا احساس ہے۔"

"بیٹھ جاؤ!"

معظم علی میر مدن کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میر مدن نے کہا: "میں تمھاری کارگزاری دیکھ چکا ہوں اور مجھے تم پر فخر ہے۔"

"میں آپ کا شکرگزار ہوں۔" معظم علی نے احسان مندی سے آنکھیں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے تمھیں اس لیے بلایا ہے کہ بنگال کی فوج کو تم جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ مرزا حسین بیگ کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ تمھیں فوج کی ملازمت پسند نہیں۔ میں سیاستدان ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ میں صرف ایک سپاہی ہوں اور ایک سپاہی کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں تمام کارآمد نوجوانوں کو اپنے گرد جمع کرلوں۔ محلے کی حفاظت کے سلسلہ میں تمھاری کارگزاری دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تمھارے سیاسی نظریات خواہ کچھ ہوں۔ موجودہ حالات میں تم بنگال کی فوج کے لیے اپنی خدمات کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکوگے۔ مرہٹوں کے ساتھ گذشتہ لڑائیوں میں میرے چند بہترین سالار شہید ہوچکے ہیں اور میری دلی خواہش ہے کہ ان میں سے ایک کی جگہ اسی وقت پُر کردی جائے۔ آج تک میں نے عہدوں کی تقسیم کے لیے کسی کی سفارش قبول نہیں کی۔ لیکن تمھارا معاملہ مختلف ہے۔"

معظم علی نے پریشان ہوکر کہا: "اگر مرزا صاحب نے میری سفارش کی ہے تو مجھے بہت افسوس ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے سمجھنے میں غلطی نہیں کریں گے۔"

میر مدن نے مسکراتے ہوئے کہا: "برخوردار! مرزا حسین بیگ نے نہیں بلکہ ان کی حویلی میں پڑی ہوئی دو سو مرہٹوں کی لاشوں نے تمھاری سفارش کی تھی۔ پھر جب میں تمھارے محلے کی گلیوں سے گزر رہا تھا تو بچوں اور بوڑھوں کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو مجھے یہ پیغام دے رہے تھے کہ اس محلے میں ایک نوجوان ایسا ہے۔ جس کی جرأت، ہمت اور ذہانت پر تم اعتماد کرسکتے ہو۔"

معظم علی نے کہا: "لیکن میں نے صرف ایک ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہیں۔"

"تم نے ایک چھوٹی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اب میں تمھیں ایک بڑی ضرورت کو پورا کرنے

کی دعوت دے رہا ہوں ۔"

معظم علی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: "اگر یہ دعوت کسی اور کی طرف سے ہوتی تو میں سوچے بغیر انکار کر دیتا لیکن آپ کے سامنے بات کرنا بھی میرے نزدیک گستاخی ہے ۔"

"تمھیں بات کرنے کی ضرورت نہیں ۔" میر مدن نے یہ کہہ کر قلم اٹھایا اور کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ جب وہ فارغ ہوا تو معظم علی نے کہا: "میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کروں گا۔ میرے تذبذب اور پریشانی کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اس قیادت سے مطمئن نہیں ہو سکتا جو قوم کے اجتماعی تقاضوں کی بجائے اپنی ضروریات کے مطابق دوستوں اور دشمنوں کے متعلق اپنا زاویۂ نگاہ بدلتی رہتی ہے ۔"

میر مدن نے لکھا ہوا کاغذ معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "سپاہی ہمیشہ سیاستدانوں کی غلطیوں کا کفارہ ادا کرتے ہیں ۔ اور تم ایک سپاہی ہو۔ میں بنگال کی فوج کو ان عناصر سے پاک کرنا چاہتا ہوں جو قوم کے مستقبل کے متعلق ہمیشہ موقع پرست سیاستدانوں کے ذہن سے سوچتے ہیں اور تمھارے جیسے حقیقت پسند اور فرض شناس نوجوانوں کے تعاون کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ تم کسی دن فوج کے سپاہیوں میں وہ اجتماعی ضمیر بیدار کر سکو گے ۔ جو سیاسی طالع آزماؤں کی کوتاہیاں برداشت نہیں کرے گا۔ یہ تمھاری تقرری کا حکم نامہ ہے ۔ میں تمھیں دو دن سوچنے کا موقع دیتا ہوں ۔ اگر تم نے دو دن کے بعد فوج میں حاضری نہ دی تو یہ حکم نامہ خود بخود منسوخ ہو جائے گا۔ اور مجھے اس بات کا افسوس ہو گا کہ میں ایک مضبوط پتھر کو قوم کے دفاعی حصار کی تعمیر کے لیے کام میں نہ لا سکا۔ مرشد آباد میں اب کچھ عرصہ حملے کا کوئی خطرہ نہیں لیکن جنوب مغربی اضلاع کے لیے خطرہ زیادہ بڑھ گیا ہے ۔ میر حبیب سے زیادہ ہماری کمزوریوں سے کوئی واقف نہیں ۔ وہ مرشد آباد میں اپنی ناکامی کا بدلہ لینے میں تاخیر نہیں کرے گا۔"

معظم علی نے کہا: "میں جانتا ہوں کہ اس وقت ، بردوان ، میدنا پور اور ہگلی کے علاقے خطرے میں ہیں اور اگر میں ایک سپاہی ہوں تو مجھے سوچنے کے لیے دو دن کی ضرورت نہیں

میں ابھی فیصلہ کرتا ہوں ۔ میں کل ہی اپنے دستے کی کمان سنبھال لوں گا۔"

* * *

علی وردی خاں مرشد آباد میں اپنی افواج کو از سر نو منظم کر رہا تھا کہ مرہٹہ افواج نے میر حبیب کی قیادت میں اچانک ہگلی کے قلعہ پر قبضہ کر لیا ۔ برسات کی وجہ سے مرشد آباد سے رسد و کمک کے راستے بند ہو چکے تھے اور مرہٹے کسی موثر مزاحمت کا سامنا کیے بغیر بردوان ، میدنا پور اور بامسر کے علاقوں میں لوٹ مار کر رہے تھے ۔ اور چند ہفتوں میں حالت یہ ہو گئی کہ مرشد آباد کے جنوب مغرب میں کوئی علاقہ مرہٹوں کے حملوں کی زد سے محفوظ نہ تھا۔

برسات کی شدت کم ہوتے ہی علی وردی خاں نے پوری تیاری کے ساتھ مرشد آباد سے پیشقدمی کی اور کٹوے کے قریب دریائے بھاگرتی کے کنارے ڈیرے ڈال دیے ۔ مرہٹہ افواج نے چاروں طرف سے سمٹ کر بھاگرتی کے دوسرے کنارے پڑاؤ ڈال دیا ۔ قریباً اکتیس دن فریقین اپنے اپنے کیمپوں سے ایک دوسرے پر گولہ باری کرتے رہے ۔ اس عرصہ میں مرہٹوں کو یہ اطلاع ملی کہ اودھ کا صوبہ دار اپنے لشکر کے ساتھ علی وردی خاں کی مدد کے لیے آ رہا ہے چنانچہ انھوں نے ایک گھمسان کی جنگ کے بعد پسپائی اختیار کی ۔ چند دنوں میں علی وردی خاں کی افواج نے مرہٹوں کو بردوان ، ہگلی اور میدنا پور کے علاقوں سے نکال دیا ۔ ہر محاذ سے مرہٹوں کی عام پسپائی شروع ہو چکی تھی اور بنگالی فوج کے تیز رفتار ہراول دستے ان کی افراتفری سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے ۔

معظم علی ہراول دستوں کے ان چند افسروں میں سے ایک تھا جو پورے لشکر کی توجہ کا مرکز بن چکے تھے ۔ دشمن کے تعاقب میں یہ لوگ باقی فوج سے ہمیشہ ایک منزل آگے رہتے تھے ۔ مرہٹہ فوج کئی کئی کوس بھاگنے کے بعد کسی محفوظ مقام پر پڑاؤ ڈالتی ۔ لیکن یہ لوگ اچانک حملہ کر کے ان کو دوبارہ بھاگنے پر مجبور کر دیتے ۔ معظم علی کی کمان میں پانچ سو سوار تھے اور وہ چند دنوں میں دشمن کی پچیس توپوں اور سامانِ رسد کی ستر گاڑیوں پر قبضہ کر چکا تھا۔

علی وردی خاں نے اڑیسہ کی سرحد تک، مرہٹوں کا تعاقب کیا۔ ایک شام بنگال کی افواج نے جھیل چھلکا کے کنارے پڑاؤ ڈالا اور علی وردی خان نے افسروں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ یہ ہماری آخری منزل ہے۔ اب اس سے آگے جانا بے سود ہے۔"

رات کے وقت جب فوج فتح کا جشن منا رہی تھی۔ میر مدن، علی وردی خاں کے خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "عالیجاہ! مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہراول فوج کے ایک سالار نے واپس آنے کی بجائے یہاں سے کوئی چودہ میل دور دشمن کے ایک قلعے پر حملہ کر دیا ہے۔"

علی وردی خاں نے برہم ہو کر کہا: "یہ میرے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ میں نے تمام فوج کو یہاں جمع ہونے کا حکم دیا تھا۔ وہ سالار کون ہے؟"

"عالیجاہ وہ معظم علی ہے۔"

"لیکن ہراول فوج کو سرحد عبور کرنے کی اجازت نہیں تھی!!"

"عالیجاہ اس نے سرحد عبور نہیں کی۔ یہ قلعہ ہمارا تھا اور مرہٹے چند سال سے اس پر قابض چلے آتے ہیں۔"

"اور وہ احمق یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پانچ سو سپاہی مرہٹوں کے تمام لشکر کو موت کے گھاٹ اتار کر قلعے پر قابض ہو جائیں گے؟"

"عالیجاہ! میرے خیال میں وہ اب تک قلعے پر قابض ہو چکا ہوگا۔ جو اطلاع مجھے ملی ہے اس کے مطابق وہ ہراول کے باقی دستوں سے کٹ کر مرہٹوں کے لشکر سے آگے نکل گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے قلعے پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اگر اسے کمک نہ بھیجی گئی تو مرہٹوں کا لشکر وہاں پہنچتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لے گا اور ہماری فوج کے پانچ سو بہترین سپاہی مارے جائیں گے۔"

علی وردی خاں نے کہا۔ "اگر صورت یہ تھی تو تمھیں کمک بھیج کر میرے پاس آنا چاہیئے تھا۔"

میر مدن مسکرایا: "عالیجاہ میں فوج کو تیاری کا حکم دے آیا ہوں۔ صرف آپ سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔"

"کتنے سپاہی لے جا رہے ہو؟"

"پانچ ہزار"

"جاؤ!"

جب میر مدن خیمے سے باہر نکل رہا تھا تو علی وردی خاں نے کہا:

"انشاء اللہ کل ہم وہ قلعہ دیکھنے آئیں گے۔"

* * *

میر مدن کا قیاس درست تھا۔ معظم علی غروب آفتاب سے دو گھنٹے بعد سرحدی قلعے پر قبضہ کر چکا تھا۔ قلعے کی حفاظت کرنے والے پچاس سپاہیوں میں سے چوبیس ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے۔ پندرہ گرفتار اور باقی ایک چور دروازے سے فرار ہو گئے تھے۔

معظم علی نے قلعے کے برج پر بنگال کا جھنڈا نصب کرنے کے بعد اپنے سپاہیوں سے کہا: "بہادرو! مجھے معلوم ہے کہ تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ لیکن آج رات شاید تمھیں آرام نصیب نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تھوڑی دیر تک مرہٹوں کا لشکر یہاں پہنچ جائے گا۔ لیکن اگر ہم صبح تک قلعے پر قبضہ رکھ سکیں تو انشاء اللہ ہماری فوج پہنچ جائے گی اور ہمارے مقدر میں ایک اور شاندار فتح ہوگی۔ لیکن اگر ہم نے ہمت ہار دی اور مرہٹے دوبارہ قلعے پر قابض ہو گئے تو ہمارے لیے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ قلعے میں اتنا بارود ہے کہ ہم چند گھنٹے دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ رات کے وقت ہمیں فصیل کے ہر حصے پر چوکس رہنا چاہیئے۔"

مرہٹہ فوج کے سرداروں کو اس بات کا یقین تھا کہ علی وردی خاں کا لشکر ان کا مزید تعاقب نہیں کرے گا اور وہ سرحدی قلعہ میں پناہ لے کر اپنے مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکیں گے۔ لیکن کوئی دو کوس کے فاصلے پر قلعے سے فرار ہونے والے سپاہیوں نے انھیں یہ خبر دی کہ

بنگال کے مٹھی بھر سپاہی قلعے پر قابض ہو چکے ہیں۔ مرہٹہ سردار قلعہ کے محافظوں کو بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دیتے ہوئے آگے بڑھے اور آدھی رات کے قریب انھوں نے قلعے سے کوئی آدھ میل دور شمال کی جانب پڑاؤ ڈال دیا۔ اس کے بعد میر حبیب اپنے پانچ ہزار آزمودہ کار سپاہی لے کر آگے بڑھا اور اس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

پچھلے پہر شدید گولہ باری کے بعد مرہٹوں کا لشکر چاروں طرف سے قلعے پر یلغار کر رہا تھا اور معظم علی کے ساتھی کمک پہنچنے کی امید پر اپنے مورچوں میں ڈٹے ہوئے تھے۔ اچانک جنوب مشرق کی سمت سے گولیوں کی بارش ہونے لگی اور مرہٹہ فوج میں افراتفری پھیل گئی۔ وہ مغرب کی طرف سمٹنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد مغرب کی طرف بھی درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ سے مرہٹوں پر گولیاں برسنے لگیں اور کوئی آدھ گھنٹے بعد مرہٹے انتہائی انتشار کی حالت میں شمال کی طرف بھاگ رہے تھے۔

میر مدن نے اپنے سواروں کو عام حملے کا حکم دیا اور آن کی آن میں میدان خالی ہو گیا۔ بنگال کی فوج پڑاؤ تک مرہٹوں کا تعاقب کرنے کے بعد واپس آ گئی۔

صبح کے دھندلکے میں معظم علی اور اس کے ساتھی قلعے سے باہر نکل کر میر مدن کا خیر مقدم کر رہے تھے۔

میر مدن کے دائیں بائیں محمود علی، یوسف، آصف اور افضل بیگ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تھے۔ میر مدن نے دروازے کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روکا اور معظم علی سے مخاطب ہو کر کہا: ”تمھیں اس قلعے پر حملہ کرنے کا حکم کس نے دیا تھا؟“

یہ سوال اور یہ لب و لہجہ معظم علی کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ ایک ثانیہ کے لیے تذبذب اور پریشانی کی حالت میں میر مدن کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے باپ، بھائی اور دوستوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب مسکرا رہے تھے۔ معظم علی نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔

”بولتے کیوں نہیں؟“ میر مدن نے ذرا سخت لہجے میں سوال کیا۔

معظم علی نے جواب دیا: ”اس قلعے پر حملہ کرنے کے لیے مجھے کسی نئے حکم کی ضرورت نہ تھی۔

میرا یہ اقدام آپ کی منشا کے عین مطابق تھا۔“

میر مدن نے مڑ کر محمود علی کی طرف دیکھا اور اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ”لیکن تمھارے سپاہی تھکے ہوئے تھے۔ انھیں آرام کی ضرورت تھی!“

ایسے حالات میں سپاہی کے لیے گھوڑے کی زین بستر سے زیادہ آرام دہ ہوتی ہے۔ پھر انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ قلعہ ان کے سفر کی آخری منزل ہے اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد وہ جی بھر کر آرام کر سکیں گے۔“

میر مدن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے کہا: ”معظم علی تمھارا یہ کارنامہ میری توقع کے عین مطابق تھا لیکن تم نے ہمیں آرام کی دعوت نہیں دی؟“

معظم علی نے جواب دیا: ”اندر چلیے، میں نے آپ سب کے لیے آرام کا انتظام کر رکھا ہے۔“

* * *

دوپہر کے وقت قلعے سے باہر ایک کشادہ خیمے کے اندر علی وردی خاں کا دربار لگا ہوا تھا اور فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے سامنے کھڑے تھے۔ معظم علی خیمے کے اندر داخل ہوا اور وہ بنگال کے حکمران کو سلام کرنے کے بعد ادب سے کھڑا ہو گیا۔

علی وردی خاں نے گاؤ تکیے کا سہارا چھوڑ کر سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا:

”نوجوان! ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا؟“

معظم علی نے جواب دیا: ”عالی جاہ! مجھے یقین تھا کہ میں چند گھنٹے اس قلعے پر قبضہ رکھ سکتا ہوں اور اتنی دیر میں سپہ سالار کمک بھیج دیں گے۔“

”لیکن کمک پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو کیا ہوتا؟“

”عالی جاہ! میں نے یکے بعد دیگرے آٹھ سوار پڑاؤ کی طرف روانہ کر دیے تھے اور میر مدن کی موجودگی میں کمک کے دیر سے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔“

”رات کے وقت اس قلعے کی طرف تمھاری رہنمائی کرنے والا کون تھا؟“

مجھے کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہ تھی۔ میں اس علاقے کا ہر نشیب و فراز اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا ہوں۔"

علی وردی خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "نوجوان! میں تمھیں اس قلعے کا محافظ مقرر کرتا ہوں۔ اگر تمھارے متعلق میر مدن کے خیالات صحیح ہیں تو مجھے یقین ہے کہ تم اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کرو گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "عالی جاہ! میں میر مدن کی توقعات پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔"

چوتھے روز معظم علی اس قلعے کے کماندار کی حیثیت میں بنگال کے لشکر کو الوداع کہہ رہا تھا۔ قلعے کے قریب ایک بلند ٹیلے سے بنگال کی افواج کی آخری جھلک دیکھنے کے بعد اس نے اپنے پانچ سو سپاہیوں کو قلعے کی چار دیواری کے اندر جمع ہونے کا حکم دیا اور ان کے سامنے تقریر کی:۔

"میرے ساتھیو! تم مجھے مغموم نظر آتے ہو۔ ہم اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور پھینک دیے گئے ہیں۔ لیکن ہمیں اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ ہمیں ایک بہت بڑی ذمہ داری کا اہل سمجھا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قلعہ بنگال کی ایک دور افتادہ چوکی نہیں بلکہ مرشد آباد کے ایک دروازے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس ویرانے میں رہ کر ان گھروں کی حفاظت کریں گے جو یہاں سے سینکڑوں کوس دور ہیں اور ہمیں یہ تسکین ہوگی کہ ہماری وجہ سے ہماری قوم کے لاکھوں افراد آرام کی نیند سوتے ہیں۔

میر مدن نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اس قلعے کو مستحکم بنانے کے لیے وہ میری ہر ممکن مدد کریں گے اور میں ان کے ساتھ یہ وعدہ کر چکا ہوں کہ جب تک ہم میں سے ایک آدمی بھی زندہ ہے، اس قلعے پر بنگال کا پرچم لہراتا رہے گا۔ یہ قلعہ بہت اہم ہے اور ہمیں اسے ناقابلِ تسخیر بنانا ہے۔"

اگلے دن معظم علی کے سپاہی اس قلعے کی ٹوٹی ہوئی دیواروں کی مرمت کا کام شروع کر چکے تھے۔

ایک سال بعد کٹک کا فوجدار اس قلعے کے معائنے کے لیے آیا تو اس نے علی وردی خاں کو یہ خط لکھا:۔

"ایک سال بعد یہ قلعہ دیکھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ میں غلطی سے کسی اور جگہ آ گیا ہوں۔ معظم علی نے اس کا نقشہ بدل دیا ہے۔ ٹوٹی ہوئی فصیل کی جگہ ایک نئی فصیل تعمیر ہو چکی ہے۔ قلعے کے اندر سپاہیوں کی رہائش کے لیے نئی کوٹھڑیاں تعمیر کی جا رہی ہیں۔ اور فصیل سے باہر خندق کھودنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس قلعے کی تعمیر نو کے لیے جو رقم منظور کی گئی تھی وہ بہت قلیل تھی اور معظم علی نے اخراجات بچانے کے لیے تعمیر اور مرمت کا بیشتر کام اپنے سپاہیوں سے لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر معظم علی کچھ عرصہ اور یہاں رہا تو دفاعی لحاظ سے ہمارا یہ سرحدی قلعہ بہت مضبوط بن جائے گا۔

اس قلعے کے دفاعی انتظامات بہتر بنانے کے علاوہ معظم علی نے ارد گرد کے جنگلات مرہٹہ ڈاکوؤں سے پاک کر دیے ہیں اور سرحد کی اجڑی ہوئی بستیاں دوبارہ آباد ہو رہی ہیں۔ ان بستیوں کی حفاظت کے لیے مقامی رضاکاروں کی فوج منظم کی جا رہی ہے اور اب تک معظم علی کے سپاہی قریباً ایک ہزار آدمیوں کو فوجی تربیت دے چکے ہیں۔ میں نے آپ کے حکم کے مطابق معظم علی سے یہ کہا تھا کہ اگر تم چاہو تو تمھیں مرشد آباد تبدیل کیا جا سکتا ہے، میرا خیال تھا کہ وہ یہ بات سن کر خوشی سے اچھل پڑے گا۔ لیکن اس نے مجھے یہ جواب دیا کہ ابھی اس علاقے میں میرا کام ختم نہیں ہوا ہے، ابھی اس علاقے میں از سر نو آباد ہونے والے لوگوں کو میری ضرورت ہے اور یہ جذبہ صرف معظم علی میں ہی نہیں بلکہ اس کا ہر سپاہی یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے کوئی اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے۔"

پانچواں باب

دن مہینوں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ سرحدی قلعے کے کمان دار کی حیثیت میں معظم علی کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب وہ مرشد آباد کے متعلق نہیں سوچتا تھا۔ کبھی وہ بچپن کے ان ایّام کا تصور کرتا جب وہ یوسف، افضل اور آصف بیگ کے ساتھ اپنے محلے کی گلیوں میں کھیلا کرتا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ کبھی اسے اپنے والدین کا خیال آتا اور اسے قلعے کی فضائیں اداس محسوس ہونے لگتیں۔ بچپن اور جوانی کے ساتھیوں کی تصویریں ایک ایک کرکے اس کے سامنے آتیں۔ اور بالآخر مرشد آباد کے متعلق اس کے تمام تصورات ایک مرکزی نقطے پر مرکوز ہوکر رہ جاتے۔ ایک ایسی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی جس کے کوئی مستقل خط و خال اس کے ذہن پر نقش نہ تھے اور اس کی دنیا قوس قزح کی رنگینیوں سے لبریز ہو جاتی۔ وہ رات کے وقت کھلی فضا میں لیٹے لیٹے کبھی بلند آواز میں اور کبھی دبی زبان سے فرحت کا نام پکارتا اور کائنات کی وسعتیں ستاروں کے نغموں سے لبریز ہو جائیں۔ لیکن پھر اچانک تصورات کے یہ سنہرے تار ٹوٹ جاتے اور وہ گہری نیند سو جاتا۔

ایک حقیقت پسند انسان کی طرح اس نے کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی کوشش نہیں کی تھی کہ زندگی کی کسی منزل میں فرحت اور اس کا راستہ ایک ہو سکتا ہے۔ تاہم فرحت کے متعلق موہوم، دلکش اور دلفریب تصورات اس کے خیالوں اور سپنوں کی دنیا پر حاوی

ہوتے جا رہے تھے۔ مرزا حسین بیگ، آصف اور افضل بیگ کے نام اس کے ہر خط کی آخری سطر ”پسندگان حال کو سلام“ کے الفاظ پر ختم ہوتی تھی اور یہی ایک جملہ اس کے نزدیک تمام خط سے زیادہ اہم ہوتا تھا۔ آصف کو خط کا جواب لکھنے کی عادت نہ تھی لیکن افضل اور حسین بیگ نہایت باقاعدگی کے ساتھ اس کے خطوط کا جواب دیا کرتے تھے۔ حسین بیگ کے خطوط میں ایک پدرانہ شفقت کا اظہار ہوتا۔ افضل کے خطوط بنگال کی سیاسی صورتِ حالات کے تذکروں سے لبریز ہوتے۔ کبھی کبھی وہ ایک آدھ فقرہ اپنی بہن کے متعلق بھی لکھ دیتا اور معظم علی اسے پڑھ کر اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگتا۔ ”فرحت اچھی ہے تمہیں سلام کہتی ہے۔ آج فرحت کہتی تھی کہ تمہاری امی جان بہت مغموم رہتی ہیں، اس لیے تمہیں چند دن کے لیے گھر ضرور آنا چاہیے“ اور معظم علی کا جی چاہتا کہ وہ اڑ کر مرشد آباد پہنچ جائے۔

اپنی والدہ کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اس کے ذہن میں یہ احساس کارفرما ہوتا کہ وہ اس کی وساطت سے فرحت کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔ معظم علی کی ماں اپنے خطوط میں فرحت کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا کرتی تھی۔ اگر کسی خط میں فرحت کا ذکر نہ ہوتا تو اسے ایک قسم کی تکلیف محسوس ہوتی اور وہ جواب میں شکایت کرتا: ”امی جان آپ نے مرزا حسین بیگ اور ان کے بال بچوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی۔“ اور ماں کی طرف سے اس قسم کا جواب آتا: ”بیٹا! میں تمہارا خط ملتے ہی ان کے ہاں گئی تھی۔ وہ سب بخریت ہیں، فرحت بہت خوش ہے، وہ تمہارے متعلق پوچھتی تھی۔ وہ جب بھی ہمارے یہاں آتی ہے تمہارے متعلق پوچھا کرتی ہے۔ پچھلے دنوں میں علیل تھی اور وہ ہر روز میری تیمارداری کے لیے آیا کرتی تھی۔ بڑی نیک لڑکی ہے، وہ پوچھتی تھی کہ تم چند دن کے لیے چھٹی لے کر گھر کیوں نہیں آ جاتے؟“

* * *

علی وردی خان ایک بیدار مغز حکمران تھا۔ لیکن اس کے عہد حکومت میں سلطنت

بنگال ایسے سیاسی شاطروں کی آماجگاہ بن چکی تھی جو قوم کی عزت و آزادی کو ہر وقت داؤں پر لگانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ مسند اقتدار کے یہ بے حیا دعویدار کبھی کسی صوبہ دار یا فوجدار کے ساتھ سازباز کرتے، اسے علی وردی خان کے مقابلے میں لے آتے اور کبھی مرہٹوں کو بنگال پر حملہ کرنے کے لیے اکساتے۔ علی وردی خاں کے عزیزوں اور رشتہ داروں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی۔ جو بنگال کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے موقع کے انتظار میں رہتے تھے۔ بنگال کے اندر حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار اور فوجی افسر اور بنگال سے باہر مرہٹہ لیڈروں کے لشکر ایسے لوگوں کے سب سے بڑے مددگار ثابت ہوتے۔

یہ وہ دور تھا جب بنگال کی سیاست رائے عامہ کے محاسبہ سے قطعاً آزاد تھی۔ علی وردی خاں کبھی اپنے گھر کے غداروں سے لڑتا اور کبھی بیرونی حملہ آوروں سے مقابلہ کرتا، جب اندرونی بغاوت کا خطرہ پیش آتا تو وہ مرہٹوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہوتا اور جب مرہٹے دوستی کے تمام معاہدے توڑ کر بنگال کے حدود میں آ گھستے تو وہ شکست خوردہ غداروں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی بجائے اٹھا کر گلے لگانے کی ضرورت محسوس کرتا۔

علی وردی خان کو اس لحاظ سے کامیاب سیاست دان کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اپنے حریفوں کے درمیان ایسا توازن قائم رکھا کہ وہ ایک متحدہ محاذ بنا کر اس کے اقتدار پر فیصلہ کن ضرب نہ لگا سکے۔ لیکن اپنے تدبر، ذہانت اور موقع شناسی کے باوجود وہ ان فتنوں کا سدباب نہ کر سکا جو بالآخر اس کے جانشین نواب سراج الدولہ کی شکست اور بنگال کی تباہی کا باعث ہوئے۔ اس کی سب سے بڑی ناکامی یہ تھی کہ وہ بیرونی خطرات کے مقابلے کے لیے ملک کے عوام کا مدافعانہ شعور اور اندرونی غداروں کے خلاف قوم کی قوت محاسبہ بیدار نہ کر سکا۔

علی وردی خاں کے دربار میں میر جعفر کے عروج کے ساتھ بنگال کی تباہی کے اسباب مکمل ہو چکے تھے۔ وہ ان قسمت آزماؤں سے کہیں زیادہ دور اندیش تھا۔ جو سلطنت کے عہدیداروں کے گٹھ جوڑ یا مرہٹوں کے تعاون سے بنگال کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، اور اس کی دور اندیشی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنا مستقبل ان انگریز تاجروں کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ جو فورٹ ولیم میں بیٹھ کر نہ صرف بنگال بلکہ پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔

میر جعفر کا طریق کار ان طالع آزماؤں سے مختلف تھا جو کھلے بندوں علی وردی خاں کے ساتھ قوت آزمائی کر کے اپنی شکست یا تباہی کا خطرہ مول لیتے تھے۔ وہ درپردہ ان تمام بغاوتوں اور سازشوں میں شریک تھا جو بتدریج بنگال کی قوتِ مدافعت کو مفلوج کر کے انگریزوں کے لیے راستہ صاف کر رہی تھیں۔

یکے بعد دیگرے بنگال کے امراء کی بغاوتوں نے اس کی کامیابی کے راستے صاف کر دیئے۔ علی وردی خاں جو عام حالات میں میر جعفر کو اپنا ایک حقیر ساتھی سمجھتا تھا، یہاں تک مجبور ہو گیا کہ اسے قابل اعتماد دوست سمجھنے لگا اور یہ ایک حقیقت پسند انسان کی مجبوری نہ تھی بلکہ اس سیاست دان کی مجبوری تھی جو برائیوں کو ختم کرنے سے ناامید ہو کر ان سے اچھے نتائج پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میر جعفر، اڑیسہ کا نائب صوبیدار مقرر ہوا تو مرشد آباد کے امراء جو اسے ہمیشہ قابل نفرت سمجھتے تھے، چونک اٹھے۔ لیکن اس نے جلد ہی ایک اور کامیابی حاصل کی یعنی ہگلی اور میدناپور کی فوجداری بھی حاصل کر لی۔ ہو سکتا ہے کہ دربار میں اپنے ایک رشتہ دار کی سازشوں سے تنگ آ کر علی وردی خان نے اسے مرشد آباد سے دور بھیجنا مناسب خیال کیا ہو۔ لیکن بنگال کے سن رسیدہ حکمران کو کیا معلوم تھا کہ ہگلی میں ایک فوجدار کی حیثیت سے میر جعفر کا اثر و رسوخ بنگال کے لیے بالآخر تباہ کن ثابت ہو گا۔ ہگلی اور میدناپور میں علی وردی خاں کی نگاہوں سے دور رہ کر وہ زیادہ آزادی کے ساتھ انگریزوں کی سازشوں میں شریک ہو سکتا تھا۔

○

اڑلیسہ پر مرہٹوں اور افغانوں کے متحدہ حملے کی خبریں مشہور رہی تھیں۔ ایک دن مرشدآباد کے پریشان حال لوگوں نے یہ سنا کہ ہگلی سے میر جعفر کی کمان میں سات ہزار سوار اور بارہ ہزار پیادہ فوج کٹک کا رخ کر رہی ہے۔ پھر کوئی ایک ہفتہ بعد یہ اطلاع آئی کہ میر جعفر دشمن کو شکست دینے کے بعد ان کا تعاقب کر رہا ہے۔

پھر جب مرشدآباد میں فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں، یہ خبر آئی کہ حملہ آوروں کی مدد کے لیے راگھوجی کا بیٹا جانوجی ایک ٹڈی دل لشکر کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے اور میر جعفر اس کا سامنا کرنے کی بجائے الٹے پاؤں بردوان کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اس کے بعد کئی دن تک اڑلیسہ کے طول و عرض میں مرہٹوں اور افغانوں کی لوٹ مار کی خبریں آتی رہیں۔

معظم علی کے دوست اور عزیز ان خبروں سے بہت پریشان تھے۔ کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ دور افتادہ سرحدی قلعے کا یہ محافظ کس حال میں ہے۔ مرزا حسین بیگ ہر روز سپہ سالار کے پاس جاتا اور معظم علی کے متعلق پوچھتا لیکن کئی دن تک وہ اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ فرحت اور اس کی والدہ صبح شام معظم علی کے گھر جاتیں اور اس کی ماں کو تسلی دینے کی کوشش کرتیں۔

چند دن بعد کسی نے یہ مشہور کر دیا کہ مرہٹوں نے سرحدی قلعہ فتح کر لیا ہے۔ معظم علی کے بیشتر ساتھی شہید ہو چکے ہیں اور باقی دشمن کی قید میں ہیں اور اس قسم کی افواہوں کے ساتھ معظم علی کی بہادرانہ موت کی فرضی داستانیں مشہور ہونے لگیں۔

ایک دن فرحت اور اس کی والدہ حسب معمول معظم علی کے گھر گئیں۔ کچھ دیر معظم علی کی ماں کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد انھوں نے رخصت چاہی۔ معظم علی کی ماں انھیں چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئی۔ وہ زنانخانے سے نکل کر مکان کے مردانہ حصے کے صحن میں داخل ہو رہی تھیں کہ گلی کی طرف سے ایک سوار اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔

"معظم!" ماں کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ کچھ دیر یہ تینوں سکتے کے عالم میں کھڑی رہیں۔

معظم علی گھوڑے سے اترا اور "السلام علیکم" کہہ کر چند قدم آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں فرحت جس کے چہرے پر اب تک کئی رنگ آ چکے تھے۔ اپنی ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"معظم! معظم!!" ماں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور اس کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو پھوٹ نکلے۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر معظم علی کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا "بیٹا! یہ تمھاری چچی جان ہیں!"

حسین بیگ کی بیوی کی آنکھوں میں بھی آنسو جمع ہو رہے تھے۔ اس نے مڑ کر فرحت کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بیٹی تم گھر جاؤ اور اپنے ابا سے کہو معظم علی آ گیا ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

فرحت اپنا چہرہ چادر میں چھپائے ہوئے جھجکتی اور سمٹتی دروازے کی طرف بڑھی۔

معظم علی نے کہا۔ "چچی جان آپ کے گھر میں خیریت ہے نا؟"

فرحت کی ماں نے جواب دیا۔ "گھر میں سب خیریت ہے بیٹا، لیکن تم نے ہم کو بہت پریشان کیا۔"

"صابر! صابر!" معظم علی کی ماں نے نوکر کو آواز دی۔

صابر آنکھیں ملتا ہوا اصطبل کے قریب کے کمرے سے باہر نکلا اور خواتین کی موجودگی کا خیال کیے بغیر بھاگتا ہوا معظم علی کے ساتھ لپٹ گیا۔

معظم علی کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "صابر! معظم کا گھوڑا اصطبل میں باندھ دو اور اس کے ابا جان اور یوسف کو اس کے آنے کی اطلاع کر دو۔"

معظم علی نے کہا۔ "نہیں امی جان! گھوڑا باندھنے کی ضرورت نہیں، ابھی مجھے باہر کچھ کام ہے۔"

ذِحنت کی ماں نے کہا: "بیٹا کہاں جارہے ہو؟ آرام سے گھر بیٹھو، تمھارے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کئی دن سے آرام نہیں کیا ہے"۔

معظم علی نے کہا: "چچی جان! میں میر مدن کے پاس جارہا ہوں اور ان سے ملاقات کے بعد شاید مجھے نواب صاحب کے سامنے حاضر ہونا پڑے۔ مجھے سیدھا وہاں جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ پہلے گھر کا حال معلوم کر لوں"۔

* * *

کوئی ایک گھنٹہ بعد معظم علی، میر مدن کے مکان کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ میر مدن نے اپنی کرسی سے اُٹھ کر اس کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اسے اپنے سامنے بٹھانے کے بعد کہا: "معظم علی! میں کسی تمہید کے بغیر تمھارے ساتھیوں کے متعلق جاننا چاہتا ہوں"

معظم علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا: "میرے ساتھی میر جعفر کی بزدلی اور بے غیرتی کا کفارہ ادا کر چکے ہیں اور میں مرشد آباد کی ماؤں اور بہنوں کے لیے یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ حکومت کی بے حسی اور نااہلیت کے باعث ان کے تین سو بیٹے، بھائی اور شوہر ہلاک ہو چکے ہیں"۔

"اور باقی؟" میر مدن نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

معظم علی نے جواب دیا: "چالیس سپاہی دشمن کی قید میں ہیں اور باقی ایک سو ساٹھ، جن میں سے تقریباً پچاس زخمی ہیں۔ قلعے سے بچ کر نکل آئے تھے۔ میں انھیں بردوان کے راستے میں ایک محفوظ مقام پر چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ہم نے دشمن کے ہاتھوں شکست نہیں کھائی۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حکومت نے ہمیں بے دست و پا بنا کر دشمن کے آگے ڈال دیا تھا۔ ہم نے پندرہ دن تک دشمن کے اس لشکر کا مقابلہ کیا جو تعداد میں ہم سے بیس گنا زیادہ تھا اور ہمیں یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ پانچ دن کے اندر کمک پہنچ جائے گی۔ میں ہر روز میر جعفر کے پاس پیغام بھیجتا تھا کہ ہمارا بارود ختم ہو رہا ہے اور ہم زیادہ دیر تک دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمیں پندرہ دن کے بعد یہ جواب ملا کہ اس قلعے کی حفاظت بے سود ہے

تم اگر دشمن کا محاصرہ توڑ کر نکل سکتے ہو تو بردوان پہنچ جاؤ۔

اگر یہی حکم ہمیں آٹھ دس دن پہلے مل جاتا تو اتنی جانیں ضائع نہ ہوتیں۔ میر جعفر کی نااہلیت اور بزدلی کے باعث ہمارے ہاتھ سے صرف ایک قلعہ ہی نہیں نکلا بلکہ اڑیسہ کے تمام علاقوں کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور اگر حکومت نے کچھ عرصہ اور اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے یقین ہے کہ پورا بنگال مرہٹوں کی شکارگاہ بن جائے گا۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان حالات میں بھی مجھے میر جعفر سے چند منٹ کی ملاقات کے لیے دو دن بردوان میں ٹھہرنا پڑا"۔

"تم میر جعفر سے مل کر آئے ہو؟"

ہاں! دو دن تک اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد میں زبردستی محل کے اندر گھس گیا اور سپاہی مجھے پکڑ کر اس کے پاس لے گئے تھے"۔

میر مدن نے کہا: " جعفر اپنی تمام برائیوں کے باوجود بنگال کے حکمران کا رشتہ دار ہے۔ تم نے اس کے ساتھ کوئی گستاخی تو نہیں کی؟"

معظم علی نے جواب دیا: "اگر کسی بزدل آدمی کو بزدل کہنا گستاخی ہے تو میں اس جرم کا ارتکاب کر چکا ہوں۔ میں علی وردی خا ں نے بھی یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ میر جعفر ان کا رشتہ دار ہونے کے باوجود اس قابل ۔ یں کہ اسے فوج میں کوئی معمولی عہدہ بھی دیا جاسکے"۔

میر مدن نے چند ثانیے سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا: "معظم علی: میں بھی ایک سپاہی ہوں اور موجودہ حالات میں تمھارے جذبات سمجھ سکتا ہوں۔ میر جعفر کے متعلق میرے خیالات تمھارے خیالات سے مختلف نہیں لیکن علی وردی خاں کے سامنے اس کی شکایت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جب اسے میدنا پور اور ہگلی کی فوجداری دی جارہی تھی تو میں نے اس کی مخالفت کی تھی، میں نے علی وردی خاں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مرہٹوں کے خلاف فوج کی کمان کے لیے اس کا انتخاب درست نہیں۔ لیکن میری باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھیں میر جعفر کی صلاحیتوں کے متعلق

کوئی غلط فہمی نہیں لیکن بڑے بڑے امراء کی بغاوتوں نے انھیں میر جعفر جیسے خوشامدیوں کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ تم ان کے سامنے اس میر جعفر کی شکایت کرو گے جس کی نااہلیت اور بزدلی کے باعث اڑلیسہ کے عوام تباہی کا سامنا کر رہے ہیں۔ لیکن میر جعفر جب ان کے سامنے پیش ہوگا تو انتہائی غصّے کی حالت میں بھی بنگال کے حکمران کا معاملہ اس شخص کے ساتھ ہوگا جو بوقتِ ضرورت اپنے آقا کے قدموں پر گرنا جانتا ہے، وہ کہے گا: "عالیجاہ! میں آپ کا حقیر غلام ہوں۔ میں خطاؤں کا پتلا ہوں۔ میری تقصیر معاف کیجیے۔" اور علی وردی خاں اگر اس کے الفاظ سے نہیں تو اس کے آنسوؤں سے ضرور متاثر ہوگا اور جب میر جعفر دیکھے گا کہ اس کے آنسو بھی رائگاں گئے ہیں تو وہ محل کی بیگمات کے پاس جائے گا اور ان سے کہے گا کہ نواب صاحب میرے دشمنوں کی باتوں میں آگئے ہیں۔ میں مظلوم ہوں۔ میں بے گناہ ہوں۔ خدا کے لیے میری سفارش کیجیے۔ سلطنت کے دشمن یہ نہیں چاہتے کہ یہ وفادار غلام نواب صاحب کے قدموں میں رہے۔" اور پھر چند دن بعد نواب صاحب اسے بلا کر یہ کہیں گے: "میر جعفر! ہم تمھاری سابقہ فروگذاشتیں معاف کرتے ہیں لیکن آئندہ کے لیے محتاط رہو۔ ہمیں دوبارہ شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔" اور وہ یہ کہے گا: "عالی جاہ! مجھے جاہ و منصب کا شوق نہیں۔ مجھے کم از کم اس وقت تک اپنی خدمت کا موقع دیجیے، جب تک سراج الدولہ سلطنت کے کاروبار میں آپ کا ہاتھ بٹانے کے قابل نہیں ہو جاتا اور ایسے امراء بنگال سے ختم نہیں ہو جاتے جو آئے دن آپ کی حکومت کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ معظم علی! مجھے اندیشہ ہے کہ تم نے بردوان میں میر جعفر سے یہ ضرور کہا ہوگا کہ تم علی وردی خاں کے پاس جا کر اس کی شکایت کرو گے اور مجھے یقین ہے کہ تم سے پہلے میر جعفر کے جاسوس، علی وردی خاں کو اس کا یہ پیغام پہنچا چکے ہوں گے کہ ایک سرپھرا نوجوان شاید آپ کے پاس پہنچ کر میری شکایت کرے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ سنی سنائی باتوں پر یقین کرنے کی بجائے مجھے صفائی کا موقع دیں گے اور یہ نوجوان آپ کے متعلق بھی نہایت باغیانہ خیالات کا اظہار کر چکا ہے۔" مرشد آباد میں

شاہی محل کے اندر اور باہر اس کے جاسوس ہر وقت چوکس رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمھارے مرشد آباد پہنچنے سے پہلے تمھارے متعلق اس کی ہدایات ان کے پاس پہنچ چکی ہوں گی۔ اب میرے ساتھ ملاقات کے بعد تم اگر علی وردی خاں کے پاس جا کر میر جعفر کی شکایت کرو گے، تو ایسے لوگ انھیں فوراً خبردار کریں گے کہ تم میری طرف سے آئے ہو"۔

معظم علی نے بددل ہو کر کہا: "مجھے معلوم نہ تھا کہ میر جعفر کے سامنے آپ بھی بے بس ہو چکے ہیں۔"

میر مدن نے جواب دیا: "معظم علی! ہم نے بُرے حالات میں جنم لیا ہے۔ لیکن کاش ہم تمام برائیوں کے خلاف لڑ سکتے۔ موجودہ حالات میں نواب علی وردی خاں بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بیک وقت ہر برائی کے خلاف نہیں لڑ سکتے۔ وہ ایک بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے خطرات کو نظر انداز کر دینے پر مجبور ہیں۔ اس وقت ان کی ساری توجہ مرہٹوں پر مرکوز ہے۔ میرے مشورہ پر اب انھوں نے اڑلیسہ کی مہم میر جعفر کی جگہ عطاء اللہ خاں کو سونپ دی ہے۔ وہ دو دن تک یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ آج تیسرے پہر علی وردی خاں نے فوج کے چند افسروں کا اجلاس طلب کیا ہے۔ اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم میر جعفر کے خلاف اپنے جذبات پر قابو رکھو گے تو میں یہ کوشش کروں گا کہ اس اجلاس میں تمھیں بھی بلا لیا جائے۔ تم تمام حالات سے واقف ہو اور اس اجلاس میں میر جعفر کی ذات کے متعلق کچھ کہے بغیر تمھیں پوری آزادی سے ان غلطیوں پر نکتہ چینی کرنے کی اجازت ہوگی جن کے باعث یہ حالات پیدا ہوتے ہیں۔ میر جعفر کی احمقانہ پسپائی کے متعلق ایک ہفتہ قبل بھرے دربار میں کافی لے دے ہو چکی ہے اور تم اس کی ذات کو ہدفِ ملامت بنا کر علی وردی خاں کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کر سکو گے۔ لیکن اگر تم گذشتہ کوتاہیوں کی تلافی کے لیے کوئی مفید تجویز پیش کر سکو تو ممکن ہے کہ اڑلیسہ کے حالات کے روبہ اصلاح ہوتے ہی وہ وقت بہت جلد آجائے جب ہم اطمینان سے میر جعفر کے قماش کے لوگوں پر توجہ دے سکیں"۔

معظم علی نے کہا: "میری پہلی تجویز یہ ہوگی کہ مرہٹوں سے جنگ کے دوران میں میر جعفر

جیسے لوگوں کو فوجی معاملات میں مداخلت سے باز رکھا جائے

میر مدن مسکرایا: "تمھیں یہ تجویز پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میر جعفر کو یہ ہدایات بھیجی جا چکی ہیں کہ وہ عطاء اللہ خاں کے ساتھ پورا تعاون کرے اور عطا اللہ خاں کو یہ اختیار دیا جا چکا ہے کہ اگر وہ کسی افسر سے مطمئن نہ ہو تو اسے سبکدوش کر دے۔"

معظم علی نے کہا: "جب مرہٹے ہمارے قلعے کا محاصرہ کیے ہوتے تھے اور مجھے کئی دن تک میر جعفر کی طرف سے اپنے پیغامات کا کوئی جواب نہیں ملا تھا تو میں نے یہ عہد کیا تھا کہ جنگ ختم ہوتے ہی میں فوج کی ملازمت سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ لیکن جب میں اپنے ساتھیوں کی بے گور و کفن لاشیں چھوڑ کر وہاں سے نکلنے لگا تو میں نے یہ عہد کیا کہ میں کم از کم ایک بار اور یہاں ضرور آؤں گا۔ میں عطاء اللہ خاں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن اگر آپ کو اس کی صلاحیتوں پر اعتماد ہے تو میں یہ درخواست کروں گا کہ مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا جائے۔"

میر مدن نے کہا: "لیکن میرا خیال تھا تم اتنی مدت کے بعد چند دن مرشد آباد رہنا چاہو گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "وہ قلعہ جہاں میرے ساتھیوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں مجھے مرشد آباد سے زیادہ عزیز ہے۔"

* * *

میر مدن سے ملاقات کے بعد معظم علی واپس گھر پہنچا تو اس کا باپ، بھائی اور حسین بیگ دیوان خانے میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ محلے کے پندرہ بیس آدمی اور بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے، وہ سب باری باری اٹھ کر اس سے بغل گیر ہوئے۔

مرزا حسین بیگ نے معظم علی کو اپنے قریب بٹھا لیا اور کہا: "بیٹا! ہم بڑی دیر سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں اور تمھاری زبان سے اڑلیسہ کے حالات سننے کے لیے بے چین ہیں۔ چند دنوں سے سرحدی علاقوں کے متعلق بہت بری خبریں آ رہی تھیں اور ہم تمھارے متعلق بہت پریشان تھے، ہمیں تمام واقعات سناؤ۔"

معظم علی نے اس کے جواب میں میر جعفر کی نااہلیت، مرہٹوں کے مظالم اور سرحدی قلعے کی تباہی کی داستان مختصراً بیان کر دی۔

اتنی دیر میں محلے کے بوڑھے، بچے اور جوان جوق در جوق مکان کے اندر داخل ہو رہے تھے اور صابر بلند آواز سے چلا رہا تھا: "بھئی ٹھہرو! اندر جگہ نہیں ہے۔ خدا کے لیے شور نہ مچاؤ اندر مرزا صاحب بیٹھے ہوتے ہیں۔"

معظم علی جلدی سے اٹھ کر باہر نکلا اور لوگ دیوانہ وار آگے بڑھ بڑھ کر اس کے ساتھ بغلگیر ہونے اور مصافحہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ محمود علی، حسین بیگ اور محلے کے باقی معززین بھی کمرے سے نکل کر باہر آ گئے اور برآمدے میں کھڑے ہو کر یہ تماشہ دیکھنے لگے۔

جب معظم علی صحن میں جمع ہونے والے لوگوں سے ملنے کے بعد ڈیوڑھی میں پہنچا تو باہر گلی میں ایک اور ہجوم دکھائی دیا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک وہ ان لوگوں سے ملنے میں مصروف رہا۔ اتنی دیر میں آصف بیگ اور افضل بیگ بھی آ گئے، وہ معظم علی کو دیکھتے ہی ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور اس کے ساتھ لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد محلے کے باقی لوگ رخصت ہو چکے تھے اور معظم علی دیوان خانے کی بجائے بالائی منزل کے ایک کمرے میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

اگلے دن سارے محلے میں یہ خبر مشہور ہو چکی تھی کہ معظم علی، عطا اللہ خاں کے ساتھ اڑلیسہ کی مہم پر جا رہا ہے۔ اس کے بھائی اور حسین بیگ کے دونوں بیٹوں نے بھی اس مہم کے لیے اپنے نام پیش کیے تھے۔ لیکن مرشد آباد کے فوجدار نے صرف آصف بیگ کو معظم علی کا ساتھ دینے کی اجازت دی ہے۔

تیسرے دن مرزا حسین بیگ کے ہاں معظم علی کی دعوت تھی، جس میں مرشد آباد کے قریباً ساٹھ امراء اور بڑے بڑے افسر مدعو تھے۔ گیارہ بجے کے قریب مرزا حسین بیگ محلے کے چند معززین کے ساتھ ڈیوڑھی سے باہر کھڑا تھا اور اس کے محل کے اندر وسیع سائبان کے نیچے جمع

ہونے والے مہمانوں کی نگاہیں اندرونی صحن کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک نوعمر لڑکا، جس کے دائیں بائیں میر مدن، راجہ رام موہن لال، عطاء اللہ خاں اور مرشد آباد کے فوجدار تھے۔ دروازے سے نمودار ہوا۔ ان کے پیچھے مرزا حسین بیگ اور محلّے کے چند اور معززین تھے۔ نوعمر خوش وضع لڑکا، جس کی قبا ہیروں سے مرصّع تھی، ایک شاہانہ تمکنت کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور سائبان کے نیچے براجمان ہونے والے مہمان اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ یہ کمسن لڑکا سلطنتِ بنگال کا ولی عہد سراج الدولہ تھا۔ وہ کسی کے ساتھ بے تکلفی سے مصافحہ کرتا اور کسی کو ہاتھ کے اشارے یا مسکراہٹ کے ساتھ سلام کا جواب دیتا ہوا آگے بڑھا اور دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ کھانے کے دوران میں مہمان سراج الدولہ کے بعد جس شخص کی طرف سب سے زیادہ دیکھ رہے تھے وہ معظم علی تھا جو اس کے بائیں ہاتھ عطاء اللہ خاں اور حسین بیگ کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حسین بیگ اٹھا اور اس نے ایک مختصر سی تقریر میں سراج الدولہ، میر مدن اور دوسرے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

سراج الدولہ نے اس کی تقریر کے جواب میں کہا: "اس وقت ہم سب کو معظم علی کا شکر گزار ہونا چاہیے جس کی خاطر اس شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے، ہمارے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہمیں اس نوجوان کی عزت افزائی کا موقع ملا ہے جس نے بنگال کی فوج کے لیے جرأت، ہمت، بہادری اور وفاداری کی قابلِ فخر مثال قائم کی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ جب اڑیسہ کی مہم سے مرشد آباد کی فوج واپس آئے تو مرزا صاحب اس طرح کی کئی اور دعوتوں کی ضرورت محسوس کریں"۔

◆

بنگال کی فوج اڑیسہ میں مرہٹوں کو پے در پے شکستیں دینے کے بعد انھیں مغرب کی طرف دھکیل رہی تھی۔ سرحد سے پچاس میل کے فاصلے پر عطاء اللہ خاں کی فوجیں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ ایک شام معظم علی ایک ہزار سواروں کے ساتھ پڑاؤ میں داخل ہوا اور گھوڑے سے

اترتے ہی سیدھا سپہ سالار کے خیمے میں پہنچا۔

عطاء اللہ خاں اپنے کاتب سے کوئی مراسلہ لکھوا رہا تھا۔ اس نے معظم علی کی طرف دیکھتے ہی کہا: "میں دو دن سے تمھارا انتظار کر رہا تھا۔ تم نے بہت دیر لگائی!"

معظم علی نے جواب دیا: "میں مرہٹوں کے تعاقب میں بہت دور نکل گیا تھا۔ اب شمال کے تمام جنگلات ان کے وجود سے پاک ہو چکے ہیں۔ پھر بھی اگر پانچ سو قیدیوں کو ساتھ لانے کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں دو دن قبل یہاں پہنچ جاتا۔ قیدیوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ سرحدی قلعے میں اس وقت مرہٹوں کے صرف ایک ہزار سپاہی موجود ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کسی تاخیر کے بغیر قلعے پر حملہ کر دیا جائے!"

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: "قلعے پر حملہ کرنے کے لیے تمھیں چند دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔ کل مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ یہاں سے چالیس میل دور شمال مغرب کی طرف مرہٹوں کا ایک لشکر جنگل میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور میں آج علی الصباح میر جعفر کی قیادت میں پانچ ہزار سواروں کو اس طرف روانہ کر چکا ہوں"۔

معظم علی نے ذرا تلخ ہو کر کہا: "میر جعفر کو ایسی مہم پر بھیجنے سے پہلے اگر آپ دشمن کو غیر مسلح کر کے درختوں کے ساتھ باندھ دیتے تو شاید یہ مہم کامیاب رہتی"۔

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: "میر جعفر اس مہم پر جانے کے لیے مصر تھا اور میں اسے گذشتہ بدنامی کا داغ دھونے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ تمھارا دوست آصف بیگ میر جعفر کے ساتھ جا چکا ہے اور مجھے میر جعفر سے زیادہ اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔ میں اس مہم پر تمھیں بھیجنا چاہتا تھا لیکن تم دیر سے پہنچے ہو"۔

معظم علی نے کہا: "میر جعفر کی رفاقت کے لیے آصف بیگ جیسے جری نوجوان کا انتخاب صحیح نہیں تھا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس مہم پر جانے کی اجازت دی جائے اور میرا ارادہ ہے کہ اس مہم سے فارغ ہو کر واپس آنے کی بجائے سرحدی قلعے پر حملہ کر دیا جائے"۔

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: "اگر تمھیں میر جعفر کی کمان میں لڑنے پر کوئی اعتراض نہیں تو میں خوشی سے تمھاری درخواست منظور کرتا ہوں"۔

معظم علی نے کہا: "میں ایک سپاہی ہوں اور اگر میر جعفر نے کوئی بہت بڑی حماقت نہ کی تو ہمارے درمیان کسی اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا"۔

عطاء اللہ خاں نے ایک نقشہ اٹھا کر کھولتے ہوئے کہا: "بیٹھ جاؤ!"

معظم علی اس کے سامنے بیٹھ گیا اور عطاء اللہ خاں نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا: "یہ مرہٹوں کا پڑاؤ ہے۔ اور میں نے میر جعفر کو یہ راستہ اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ کل طلوع آفتاب سے پہلے وہ دشمن پر حملہ کر دے گا۔ میرے خیال میں تمھیں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ تمھیں تازہ دم سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ میں تمھارے لیے پانچ سو سواروں کو تیاری کا حکم دیتا ہوں۔ اتنی دیر میں تم اپنی رہنمائی کے لیے اس نقشے کی نقل تیار کر لو"۔

معظم علی نے جواب دیا: "یہ نقشہ مجھے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح یاد ہے۔ یہ دیکھیے مرہٹوں کے پڑاؤ سے صرف تیس میل دور وہ قلعہ ہے۔ جہاں میں کئی برس گذار چکا ہوں۔ ان جنگلوں میں میں نے بارہا مرہٹوں کا تعاقب کیا ہے۔ مرہٹوں کے پڑاؤ کے آس پاس کے ٹیلے وادیاں اور ندیاں اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مجھے صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ میں شاید حملے سے پہلے نہ پہنچ سکوں"۔

عطاء اللہ خاں نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ تم وقت پر پہنچ جاؤ گے"۔

معظم علی سپہ سالار کے ساتھ خیمے سے باہر نکلا اور قریباً نصف گھنٹہ بعد اس کی قیادت میں پانچ سو سوار شمال مغرب کا رُخ کر رہے تھے۔

* * *

اگلی صبح چند ٹیلے عبور کرنے کے بعد معظم علی کو اپنے سامنے ایک ندی کے کنارے خیموں کی ایک قطار دکھائی دی۔ مسلح سپاہیوں کی چند ٹولیاں ان خیموں کے درمیان اِدھر اُدھر گشت

کر رہی تھیں۔ وہ گھوڑا بھگاتا ہوا سپاہیوں کی ایک ٹولی کے قریب پہنچا۔ ایک نوجوان افسر نے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا۔ معظم علی نے کسی توقف کے بغیر سوال کیا۔ "تم نے رات کے وقت یہاں پڑاؤ ڈالا تھا؟"

"جی ہاں!"

"فوج کو یہاں سے روانہ ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟"

"کوئی ڈیڑھ گھنٹہ"۔

"رات کے وقت دشمن کی نقل و حرکت کے متعلق کوئی اطلاع ملی تھی؟"

"جی ہاں! رات کے وقت ہمیں پتہ چلا تھا کہ دشمن یہاں سے کوئی تین کوس کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے"۔

"اور وہ سب گھوڑوں پر سوار ہو کر گئے ہیں؟"

"جی ہاں! اس مسئلے پر کافی بحث ہوئی تھی کہ جنگل میں فوج کو اس سے آگے پیدل پیشقدمی کرنی چاہیئے یا گھوڑوں پر۔ آصف بیگ کا خیال تھا کہ فوج کو اس سے آگے پیدل جانا چاہیئے لیکن میر جعفر یہ کہتے تھے کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے"۔

معظم علی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "میر جعفر یہ سمجھتے ہیں کہ بھاگنے کے لیے پاؤں کی بجائے گھوڑے زیادہ کام دیتے ہیں"۔ پھر وہ اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم میں سے پچاس آدمی میرے ساتھ پیدل چلیں اور دو سو اس ندی کے کنارے درختوں اور پتھروں کی آڑ میں مورچے بنا لیں۔ باقی تمام گھوڑوں کو لے کر ان ٹیلوں کے پیچھے چھپ جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ میر جعفر دشمن کو بہت جلد یہاں لے آئیں گے"۔

پھر وہ پڑاؤ کے محافظ کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تم یہاں سے یہ خیمے اکھاڑ لو اور رسد کا ضروری سامان ان ٹیلوں کے پیچھے لے جاؤ"۔

نوجوان افسر نے گھبرا کر کہا۔ "لیکن جناب! میر جعفر کے حکم کے بغیر۔۔۔؟"

معظم علی نے جھنجلا کر کہا: "اگر تم نے رات کے وقت اس جگہ پڑاؤ ڈالا تو مجھے یقین ہے کہ تھوڑی دیر بعد میر جعفر کو حکم دینے کا ہوش نہیں ہوگا اور میں اس کے سامنے تمھیں حکم عدولی کی سزا دے سکوں گا۔"

"لیکن جناب میں نے کوئی حکم عدولی نہیں کی۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ میر جعفر...!"

معظم علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "تمھیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں دس منٹ کے بعد اس جگہ پڑاؤ کا کوئی نشان نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"بہت اچھا جناب!"

اچانک جنگل میں دور سے بندوقوں کے دھماکے سنائی دیئے اور معظم علی نے گھوڑے سے کود کر اپنی بندوق سنبھالتے ہوئے کہا "بہادرو! جلدی کرو، میر جعفر میری توقع سے پہلے واپس تشریف لا رہے ہیں۔"

پچاس سپاہی گھوڑوں سے اتر کر معظم علی کے پیچھے ندی میں گھس پڑے اور گھٹنے گھٹنے پانی میں سے گزرنے کے بعد جنگل میں غائب ہو گئے۔ کوئی ایک میل جنگل میں چلنے کے بعد انھیں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ معظم علی نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور وہ اس کے دائیں بائیں بکھر کر درختوں کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ چند منٹ بعد بنگال کی فوج کے چند سوار دکھائی دیئے جن میں سے ایک میر جعفر تھا۔

"ٹھہریے! ٹھہریے!!" معظم علی نے دونوں ہاتھ بلند کر کے انھیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ درختوں اور جھاڑیوں سے بچتے ہوئے نکل گئے۔ پھر چند دستے نمودار ہوئے۔ ایک افسر نے معظم علی کو دیکھ کر اپنا گھوڑا روکا اور معظم علی نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے سوال: "کیا ہوا۔ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟"

مرہٹوں نے ہم پر راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ ہماری بیشتر فوج ان کے گھیرے میں آ چکی ہے۔"

معظم علی نے چلا کر کہا: "لیکن تم بھاگ کیوں رہے ہو؟"

"یہ میر جعفر کا حکم ہے۔"

"مرزا آصف بیگ کہاں ہے؟"

"وہ حملے کے وقت اپنی ایک ہزار فوج کے ساتھ گھوڑوں سے اتر کر جنگل میں گھس گیا تھا اور اب معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوگا؟ میر جعفر اس سے بہت خفا ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "اگر آصف کے ایک ہزار جانباز ابھی تک جنگل میں ہیں تو مرہٹے کھلے میدان میں تم سے لڑنے کے لیے نہیں آئیں گے۔ تم تمام سواروں کو اس جگہ روکنے کی کوشش کرو، میں جوابی حملہ کرنا چاہتا ہوں!"

افسر نے جواب دیا: "لیکن میر جعفر اسے حکم عدولی سمجھیں گے۔"

معظم علی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا: "میر جعفر مرشد آباد پہنچنے سے پہلے دم نہیں لیں گے اور تم اس وقت میری کمان میں ہو۔ اگر کسی سوار نے آگے جانے کی کوشش کی تو میں اپنے سپاہیوں کو حکم دوں گا کہ وہ اسے بلا توقف گولی مار دیں۔"

افسر نے کہا: "اگر آپ یہ ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں تو میں بھاگنے کی بجائے آپ کی رفاقت میں جان دینا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں۔"

اتنی دیر میں کوئی سات سو سوار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ افسر نے انھیں حکم دیا اور وہ جنگل میں پھیل کر پیچھے آنے والے ساتھیوں کو روکنے لگے اور تھوڑی دیر میں چار ہزار سپاہی وہاں جمع ہو گئے۔ معظم علی نے آٹھ سو سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے گھوڑے ندی کے پار لے جائیں اور باقی فوج کو چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم کر کے جنگل میں پیشقدمی شروع کر دی۔ راستے میں سپاہیوں کے چند اور منتشر دستے ان کے ساتھ ملتے گئے۔ جنگل میں چند مقامات پر مرہٹوں کے اکا دکا دستوں کیساتھ ان کا تصادم ہوا لیکن وہ معمولی مزاحمت کے بعد بھاگ نکلے۔

کوئی دو گھنٹے بعد انھیں ایک طرف بندوقوں کے دھماکے اور لڑنے والوں کی چیخ پکار سنائی دی۔ وہ گھنی جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے ایک نصف دائرہ میں آگے بڑھے۔

معظم علی کو سامنے ایک چھوٹا سا ٹیلہ دکھائی دیا۔ وہ چند آدمیوں کے ساتھ بھاگتا ہوا ٹیلے کے جنوب کی طرف ایک چھوٹی سی جھیل دکھائی دی جس کے کناروں پر آصف بیگ کے سپاہیوں اور مرہٹوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ آن کی آن میں وہ ٹیلے سے نیچے اتر کر اپنی فوج کو نئی ہدایات دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بنگال کا لشکر دائیں اور بائیں طرف سے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر جھیل کے گرد گھیرا ڈالنے کے بعد مرہٹوں پر حملہ کر چکا تھا۔ مرہٹوں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد تھی۔ لیکن ان کے لیے یہ حملہ جس قدر شدید تھا۔ اسی قدر غیر متوقع تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد معظم علی کے سپاہی جھیل کے اردگرد دشمن کی لاشوں کے انبار لگا چکے تھے اور مرہٹے انتہائی سراسیمگی کی حالت میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے

قریباً چالیس منٹ کے بعد میدان صاف ہو چکا تھا۔ شکست خوردہ دشمن کے کوئی ڈیڑھ سو آدمی جو بدحواسی کی حالت میں جھیل میں کودنے کے بعد ایک چھوٹے سے ٹاپو پر جمع ہو گئے ہتھیار ڈال چکے تھے۔ بنگال کے ڈیڑھ سو سپاہی زخمی اور اسی شہید ہوئے۔ آصف بیگ جس کا جسم زخموں سے چھلنی تھا۔ جھیل کے کنارے ایک درخت کے نیچے پڑا کراہ رہا تھا۔ چند سپاہی اور افسر اس کے گرد کھڑے تھے۔ معظم علی بھاگتا ہوا پہنچا اور آصف کے قریب بیٹھ گیا۔

آصف نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"دوست تم ذرا دیر سے آئے"

معظم علی نے اردگرد کھڑے ہونے والے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "جراح کو بلاؤ۔ جلدی کرو!"

آصف بیگ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا "جراح کی ضرورت نہیں! تم اطمینان سے میرے ساتھ باتیں کرتے رہو۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمھارے یہاں آنے کی توقع نہ تھی۔ اور میں تھوڑی دیر پہلے یہ سوچ رہا تھا کہ کئی باتیں ایسی تھیں جو میں تم سے نہیں کہہ سکا" پھر اس نے اردگرد جمع ہونے والوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔

"معظم علی!" آصف نے قدرے توقف کے بعد کہا: "مجھے اسی جگہ دفن کر دینا اور ابا جان سے یہ کہنا کہ میں نے تمام زخم سینے پر کھائے تھے۔ افضل کو میری طرف سے نصیحت کرنا کہ وہ کبھی کسی بزدل آدمی کی قیادت میں لڑنے کی غلطی نہ کرے۔ میں اپنی فوج کے سپاہی تمھیں سونپتا ہوں۔ اور میرے جو ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔ ان کے لواحقین کے لیے حکومت سے اعانت حاصل کرنا تمھارا فرض ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم کسی دن اڑلیسہ کے گورنر بنو اور پھر میری قبر پر آکر یہ کہو: آصف! میں تمھیں بھولا نہیں — اباجان کی یہ خواہش تھی کہ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد میری شادی کر دی جائے۔ رخصت ہونے سے پہلے انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ آج ہی ڈھاکہ کے کسی اونچے گھرانے سے میرے لیے پیغام آیا ہے۔ تمھارے متعلق میرے دل میں ایک خواہش تھی، لیکن کاش میں یہاں آنے سے پہلے ابا جان کو کچھ بتا سکتا۔ معظم علی! تمھیں ایک بھائی کے منہ سے ایسی باتیں عجیب معلوم ہوں گی۔ لیکن اب تمھیں شاید یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہ ہو۔ کہ میں اپنے دل میں فرحت کا مستقبل تمھارے ساتھ وابستہ کر چکا تھا۔ معظم! وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ امی جان کسی اور جگہ اس کا رشتہ کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن مجھے اس کے دل کا حال معلوم تھا اور میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اباجان کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ وہ اس کے مستقبل کے متعلق کیا فیصلہ کریں گے۔ لیکن اگر ان کا ارادہ کچھ اور ہو تو انھیں اتنا ضرور بتا دینا کہ فرحت کے متعلق میری خواہش یہ تھی۔ یہ باتیں میں نے اس لیے کہی ہیں کہ فرحت کے دل کا حال مجھے معلوم ہے۔ وہ تمھیں چاہتی ہے جب تم اڑلیسہ کے محاذ پر جا رہے تھے اس کے آنسو مجھے سمجھانے کے لیے کافی تھے۔ اس سے پہلے میں نے اپنی ننھی بہن کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔"

آصف نے یہاں تک کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

معظم علی نے ایک سپاہی کو پانی لانے کے لیے کہا اور اس نے اپنی چھاگل کھول کر آگے

کر دی۔ معظم علی نے آصف کی گردن کو سہارا دے کر اٹھایا اور پانی کے چند گھونٹ پلانے کے بعد اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

آصف بیگ نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور نحیف آواز میں کہا۔ "میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنی زندگی کا آخری فرض پورا کر چکا ہوں"۔

کوئی ایک گھنٹہ تک آصف کی یہ حالت رہی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آتا اور معظم علی سے چند باتیں کرنے کے بعد پھر آنکھیں بند کر لیتا۔

معظم علی میں بات کرنے یا ہلنے کی طاقت نہ تھی وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فوج کے سپاہی ان کے گرد سر جھکائے کھڑے تھے۔ آصف بیگ نے آخری بار آنکھیں کھولیں اور آسمان کی نیلگوں فضاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈوبتی آواز میں "ابا جان"۔ "امی جان" "افضل" اور "فرحت" کے الفاظ چند بار دہرائے اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

معظم علی نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ پھر کچھ دیر اس کے سینے کے ساتھ کان لگانے کے بعد "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہہ کر اس کا سر زمین پر رکھ دیا۔ اپنی آنکھوں سے ابلتے ہوئے آنسو پونچھنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان سب کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اور جنگل کی خاموش فضا میں ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

معظم نے شہیدوں کو دفن کرنے کا حکم دیا اور میر جعفر کو لڑائی کے واقعات کی اطلاع دینے کے لیے ایک افسر اور چند سپاہی روانہ کر دیئے۔

○

ندی کے کنارے میر جعفر بڑی بے چینی کے ساتھ فوج کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ معظم علی کو دیکھتے ہی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور بولا "نوجوان تمہارا یہ اقدام میری خواہش کے مطابق نہ تھا۔ میری خواہش یہ تھی کہ مرہٹوں کے ساتھ کھلے میدان میں جنگ کی جائے۔ لیکن میں

تمہیں مبارک باد کا مستحق سمجھتا ہوں"۔

معظم علی نے جواب دیا۔ "مرہٹوں کو آپ کے تعاقب کے لیے کھلے میدان میں آنے کی ضرورت نہ تھی۔ بالخصوص اس حالت میں جب کہ وہ آصف بیگ کے ایک ہزار سپاہیوں پر اپنی تلواروں کی تیزی آزما سکتے تھے"۔

میر جعفر نے کہا۔ "مجھے آصف بیگ کی موت کا افسوس ہے۔ لیکن اگر وہ میری حکم عدولی نہ کرتا تو یہ صورت حالات پیدا نہ ہوتی"۔

"لیکن اگر آپ بھی اس کی طرح جان دینا پسند کرتے تو یہ صورت حالات پیدا نہ ہوتی"۔

میر جعفر کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ لیکن اس نے اس موضوع پر مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہ کی۔

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے چند کوس دور ایک قلعے پر حملے کی اجازت دی جائے"۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم پہلے پڑاؤ میں جا کر اس مہم کے لیے عطاء اللہ کی اجازت حاصل کر لو!"

"میں عطاء اللہ خاں سے اجازت لے چکا ہوں۔ مجھے صرف آپ کے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس جنگل سے شکست کھا کر بھاگنے کے بعد مرہٹے اس قلعے کا رخ کریں گے۔ اس لیے میں کسی تاخیر کے بغیر پیشقدمی کرنا چاہتا ہوں"۔

میر جعفر نے کہا۔ "میں اس مہم میں تمہارا ساتھ دوں گا"۔

"لیکن اس چھوٹی سی مہم کے لیے آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی فوج کے ڈیڑھ ہزار سپاہی ساتھ لے جانے کی اجازت دیں"۔

"نہیں، میں خود بھی چلوں گا"۔

"بہت اچھا! لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مرزا حسین بیگ کو آصف کی موت کی اطلاع

دینے کے بدلے کوئی ایلچی روانہ کردیں "۔

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔ اب بتاؤ ہمیں کب یہاں سے روانہ ہونا چاہیئے؟"

"ابھی! اسی وقت!" معظم علی نے جواب دیا۔

* * *

اگلے دن غروب آفتاب سے قبل بنگال کی فوج کسی شدید مزاحمت کا سامنا کیے بغیر سرحدی قلعے پر قبضہ کر چکی تھی۔ میر جعفر کی حیثیت اس مہم میں ایک خاموش تماشائی سے زیادہ نہ تھی۔ اور فوج کی کمان عملاً معظم علی کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن فتح کے بعد وہ عطاء اللہ خاں اڑیسہ کے صوبیدار، میر مدن اور علی وردی خاں کے نام اس قسم کے خطوط لکھ رہا تھا۔

"خدا نے ہمیں بہت بڑی فتح دی ہے۔ ہم نے اڑیسہ کی سرحد پر مرہٹوں کا سب سے بڑا مستقر چھین لیا ہے۔ اب مجھے امید ہے کہ دشمن ایک مدت تک اپنے زخم چاٹتا رہے گا۔"

علی وردی خاں کے نام اس کے خط کے آخری فقرے یہ تھے "اس حقیر غلام نے اپنی بساط کے مطابق حضور پُرنور کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اب میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مرشد آباد پہنچ کر حضور کی قدم بوسی کا شرف حاصل کروں اور حضور کو یہ خوشخبری سناؤں کہ اڑیسہ کی سرزمین دشمن کے وجود سے پاک ہو چکی ہے۔"

تیسرے دن عطاء اللہ خاں باقی فوج کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور اس نے کوئی دو ہفتے قلعے میں قیام کیا۔ اس عرصے میں اسے شمال مغرب کے سرحدی علاقوں پر مرہٹوں کے تازہ حملوں کی خبر ملی اور اس نے معظم علی کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ کوچ کا حکم دیا۔

دس دن بعد معظم علی واپس آیا اور اس نے اطلاع دی کہ شمال مغرب کے سرحدی علاقے مرہٹوں کے وجود سے پاک ہو چکے ہیں۔ عطاء اللہ خاں نے معظم علی کو قلعے کی حفاظت پر متعین کرکے کٹک کی طرف کوچ کیا۔

تین ماہ کے بعد معظم علی نے دو مہینے کی چھٹی لی اور مرشد آباد روانہ ہوا۔

* * *

ایک روز دوپہر کے وقت مرزا حسین بیگ بخار کی حالت میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی بیوی، افضل اور فرحت اس کے بستر کے قریب بیٹھے ہوتے تھے۔ ایک خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے معظم علی کی آمد کی اطلاع دی۔ افضل جلدی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ فرحت برابر کے کمرے میں چلی گئی اور نیم وا دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی، افضل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ حسین بیگ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ افضل کی والدہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

معظم علی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے کرب انگیز لہجے میں کہا "چچا جان! چچی جان! مجھے افسوس ہے کہ میں آخری منزل تک آصف کا ساتھ نہ دے سکا۔"

"بیٹھ جاؤ بیٹا!" حسین بیگ نے اس کی طرف پدرانہ شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ بالآخر حسین بیگ نے مہر سکوت توڑی "معظم! میں اس کی قبر دیکھنے کے لیے وہاں جانا چاہتا تھا، لیکن بیماری کے باعث سفر کرنے کے قابل نہ رہا۔ مجھے تمہارا خط ملا تھا۔ لیکن میری یہ خواہش تھی کہ اس کی شہادت کے تمام واقعات تمہاری زبانی سنوں۔"

معظم علی نے شروع سے لے کر آخر تک تمام واقعات بیان کر دیئے۔ جب وہ آصف کی موت کی تفصیلات سنا رہا تھا تو اس کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔ فرحت سے متعلق وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا کہ آخری لمحات میں آصف بار بار اپنی بہن کو یاد کرتا تھا۔

اس کے بعد معظم علی صبح شام حسین بیگ کی تیمارداری کے لیے جاتا اور کئی کئی گھنٹے

اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ مرشدآباد میں اس نے ابھی کوئی بیس دن گذارے تھے کہ اسے میرمدن نے اپنے پاس بلایا اور کہا: "معظم علی! سرحد کے حالات ٹھیک نہیں۔ مرہٹوں نے پھر سر اٹھایا ہے اور جاسوسوں نے علی وردی خاں کو اطلاع دی ہے کہ عطاء اللہ خاں اور میر جعفر کٹک میں بیٹھ کر حکومت کے خلاف کوئی خطرناک سازش کر رہے ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم فوراً سرحدی قلعے میں پہنچ جاؤ۔ اور اس بات کا خیال رکھو کہ یہ لوگ مرہٹوں کے ساتھ کوئی ساز باز نہ کرسکیں۔"

"اگر حالات ایسے ہیں تو میں آج ہی روانہ ہوجاؤں گا۔"

میرمدن نے میز سے ایک کاغذ اٹھایا اور معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ تمھارے نئے عہدہ کے متعلق علی وردی خاں کا حکم نامہ ہے۔ تمھیں اڑلیسہ کے نائب فوجدار کی حیثیت میں سرحدی اضلاع کا محافظ مقرر کیا گیا ہے۔ تمھاری کمان میں مستقل طور پر دو ہزار سپاہی دیئے گئے ہیں اور کٹک کے صوبیدار کو یہ ہدایت کردی گئی ہے کہ سرحد پر دفاعی چوکیاں تعمیر کرنے کے لیے سرکاری خزانہ سے مطلوبہ رقم ادا کردی جائے۔ آج تمھارے لیے کوچ کی تیاری کرنا مشکل ہوگا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم کل صبح تڑکے روانہ ہوجاؤ۔ عطاء اللہ خاں کو یہ حکم بھیج دیا جائے گا، کہ وہ مزید ایک ہزار سپاہی تمھاری کمان میں دے دے۔"

میرمدن سے ملاقات کے بعد معظم علی اپنے گھر پہنچا تو اس کی والدہ بالاخانے کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

معظم علی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "امی جان! میری چھٹی منسوخ کردی گئی ہے اور میں کل صبح یہاں سے جارہا ہوں۔"

ماں نے پریشان ہوکر کہا: "بیٹا تمھیں کسی خطرناک مہم پر تو نہیں بھیجا جارہا ہے؟"

"نہیں امی جان! مجھے اڑلیسہ کے سرحدی اضلاع کا نائب فوجدار مقرر کیا گیا ہے۔"

"نائب فوجدار؟" ماں نے چونک کر سوال کیا۔

"ہاں امی جان! کیا آپ کے خیال میں نائب فوجدار بہت بڑا ہوتا ہے؟"

"نہیں بیٹا! میں تو دعا کیا کرتی ہوں کہ تم کسی دن بنگال کی فوج کے سپہ سالار بنو — تمھارے ابا جان یہ خبر سن کر بہت خوش ہوں گے۔ ہاں میں تمھیں ایک بات بتانا بھول گئی تھی — آصف کی موت کی خبر آنے سے چند دن پہلے ڈھاکہ کا کوئی بہت بڑا رئیس، جو مرزا حسین بیگ کا رشتہ دار ہے۔ اپنی بیوی کے ساتھ ان کے یہاں آیا تھا۔ وہ اپنے لڑکے کے لیے فرحت کا رشتہ مانگتے تھے۔ حسین بیگ کی بیوی کی یہی خواہش تھی کہ فرحت کی منگنی وہاں کردی جائے لیکن مرزا صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جب آصف واپس آئے گا تو میں اس کے ساتھ ڈھاکہ جاؤں گا، اور لڑکے کو دیکھ کر فیصلہ کروں گا۔ بیٹا! میں کبھی کبھی یہ سوچا کرتی تھی کہ فرحت میری بہو بنے گی لیکن ایک دن میں نے تمھارے ابا سے ذکر کیا تو وہ مجھ پر برس پڑے کہنے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں سے نکلوانا چاہتی ہو۔ مرزا صاحب کا یہ احسان تھوڑا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اس قدر مہربانی سے پیش آتے ہیں تمھیں معلوم نہیں کہ وہ خاندان جس نے فرحت کا رشتہ مانگا ہے، کوئی ڈیڑھ دو سو گاؤں کا مالک ہے، پھر ہماری اگر کوئی حیثیت ہوتی بھی تو مرزا حسین بیگ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی برادری سے باہر لڑکی کا رشتہ کریں گے۔ اگر تمھارے ابا جان منع نہ کرتے تو میں شاید فرحت کی ماں سے اس کے متعلق پوچھ بیٹھتی۔ فرحت بہت اچھی لڑکی ہے، اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ میری بہو بنے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں تمھاری ترقی کے لیے بہت دعا کیا کرتی ہوں۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتی ہوں کہ مرزا صاحب تم سے بلاوجہ اس قدر محبت نہیں کرتے۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے فرحت کے متعلق اپنے دل میں کوئی فیصلہ کر رکھا ہو اور وہ اس دن کا انتظار کر رہے ہوں جب تم اپنی ذاتی قابلیت کے بل بوتے پر اونچے خاندان کے لڑکوں کی ہمسری کا دعویٰ کرسکو۔ ورنہ فرحت کے لیے لکھنؤ کے ایک بہت بڑے گھرانے کا رشتہ بھی آیا تھا اور مرزا صاحب نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔"

"امی جان !"

"کیا ہے بیٹا؟"

"کچھ نہیں امی جان ـــ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھ سے پہلے آپ کو بھائی یوسف کے متعلق سوچنا چاہیئے تھا۔"

ماں نے جواب دیا: "یوسف کے لیے تین رشتے آئے ہیں۔ لیکن وہ تینوں لڑکیاں مجھے پسند نہیں۔ عبداللہ خاں کی لڑکی مجھے پسند تھی۔ لیکن وہ یہاں سے کلکتہ جا چکے ہیں۔ تمھارے اباجان نے کئی بار وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر انھیں فرصت نہیں ملی۔ پچھلے مہینے ان کا خط آیا تھا کہ وہ اس سال حج کے لیے جا رہے ہیں۔ جب وہ حج سے واپس آئیں گے تو میں تمھارے اباجان کو ضرور بھیجوں گی۔"

معظم علی کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ اور پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" ماں نے پوچھا۔

"مرزا صاحب کے پاس۔"

دروازے کے قریب پہنچ کر معظم علی نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا اور کہا:

"امی جان! سچ بتایئے آپ کو فرحت بہت پسند ہے؟"

"ہاں بیٹا!"

"لیکن امی جان میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔"

"جھوٹا کہیں کا۔" ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور معظم علی ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

چھٹا باب

عطاء اللہ خاں کٹک کے قلعے کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ معظم علی کمرے میں داخل ہوا اور اس کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

عطاء اللہ خاں نے کہا: "مجھے کل ہی تمھارے متعلق حکم ملا تھا۔ میں تمھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تمھارا نیا عہدہ اڑلیسہ کے لیے خیر و برکت کا باعث ہوگا۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟"

"اگر فوج تیار ہے تو میں کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"فوج کے لیے چند دن تمھیں انتظار کرنا پڑے گا۔ میں جو دستے تمھاری کمان میں دینا چاہتا ہوں۔ وہ بردوان اور میدنا پور کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ میں آج ہی انھیں حکم بھیجتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا: "سرحدی علاقوں پر مرہٹوں کی تازہ سرگرمیوں کے پیش نظر میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ سپاہیوں کو وہاں سے سیدھا سرحدی قلعے میں پہنچنے کا حکم بھیج دیں۔ میں کل علی الصبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"بہت اچھا۔ میں ابھی انھیں حکم بھیج دیتا ہوں۔ آج آپ میرے مہمان ہیں۔ میں نے میر جعفر سے آپ کی ترقی کا ذکر کیا تھا۔ وہ سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔"

"میر جعفر یہاں ہیں؟ میرا تو خیال تھا کہ وہ بردوان میں ہوں گے۔"

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا "وہ ایک ضروری مشورے کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ان سے خوش نہیں۔ کہیئے آپ مرشدآباد میں حضور نواب صاحب سے ملے تھے؟"

"نہیں!" معظم علی نے جواب دیا "میں وہاں صرف میر مدن سے ملا تھا۔"

"اچھا یہ بتائیے آپ نے میر مدن سے میر جعفر کے متعلق کوئی بات کی تھی؟"

"نہیں ان کے ساتھ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔"

عطاء اللہ خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا "میر جعفر کا خیال ہے کہ دربار میں کر بعض امراء ان کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں، اور کئی مرتبہ انھوں نے مجھے بھی خبردار کیا ہے کہ مرشدآباد میں تمھارے خلاف بھی طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی ہیں۔"

"میرا تو یہ خیال ہے کہ حکومت مرہٹوں کے خلاف آپ کی کارگزاری پر بہت خوش ہے تاہم اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔"

"مجھے آپ جیسے مخلص دوستوں کے نیک مشوروں کی ضرورت ہے۔ کہیے!"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میر جعفر کے متعلق محتاط رہیں۔ میر جعفر اگر کوئی غلطی کریں تو ان کا سب سے بڑا تحفظ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بنگال کے حکمران کے رشتہ دار ہیں۔"

عطاء اللہ خاں نے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ میں ذاتی طور پر میر جعفر کو پسند نہیں کرتا۔"

"یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔"

"میں آپ کا تشکر گذار ہوں۔ لیکن آپ کے دل میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا کہ میر جعفر مجھے بہکا سکتا ہے؟"

معظم علی نے پریشان ہو کر جواب دیا "میں نے یہ نہیں کہا کہ میر جعفر آپ کو بہکا سکتا ہے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ آپ محتاط رہیں۔"

عطاء اللہ چند ثانیے غور سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد بولا "معظم علی! میں تمھیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔ اگر مرشدآباد میں میرے دشمن میرے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں تو مجھے آگاہ کرنا تمھارا فرض ہے۔"

"مجھے آپ کے خلاف کسی سازش کا علم نہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اس قدر پریشان ہوں گے تو میں آپ سے ایسی باتیں نہ کرتا۔ میر جعفر کے متعلق یہ بات عام ہو چکی ہے کہ بنگال میں ہر سازش سب سے پہلے ان کے دماغ میں جنم لیتی ہے۔ وہ چند جاہ پسندوں کو پہلے حکومت کے خلاف بغاوت پر اکساتے ہیں اور پھر اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے علی وردی خاں کو باخبر کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بغاوت کچل دی جاتی ہے۔ چند مجرم اور ان کے ساتھ چند بے گناہ مارے جاتے ہیں اور میر جعفر کو یہ ثابت کرنے کا موقع مل جاتا ہے کہ اپنی انتہائی نااہلی کے باوجود وہ حکومت کے لیے ایک کارآمد آدمی ہیں۔ میں تو یہاں تک محسوس کرتا ہوں کہ ایک دن ایسا آئے گا جب علی وردی خاں کو امراء کی آئے دن کی بغاوتیں اسی قدر بددل کر دیں گی کہ انھیں میر جعفر کے سوا اپنا کوئی خیر خواہ نظر نہ آئے گا اور یہ دن بنگال کی تاریخ کا بدترین دن ہوگا۔"

عطاء اللہ خاں نے کہا "میں ایک سپاہی ہوں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ میر جعفر کیا کرنا چاہتا ہے اور علی وردی خاں اس کے متعلق کیا سوچتے ہیں۔"

ایک سپاہی اندر داخل ہوا اور اس نے عطاء اللہ خاں سے کہا "میر جعفر تشریف لائے ہیں۔"

معظم علی نے اٹھ کر کہا "اب مجھے اجازت دیجیے!"

"بہت اچھا" عطاء اللہ خاں نے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا "آپ میرے مکان پر جا کر آرام کریں۔"

میر جعفر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے عطاء اللہ خاں کے ساتھ مصافحہ کرنے کے

بعد معظم علی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "آپ کب آئے؟"

"میں ابھی یہاں پہنچا ہوں۔"

"تشریف رکھیے!" میر جعفر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، مجھے اب اجازت دیجیے!"

عطاء اللہ خاں نے کہا "میر صاحب! یہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ ہم شام کے وقت باتیں کریں گے۔"

پھر وہ سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "تم انھیں میرے مکان پر چھوڑ آؤ۔"

معظم علی سپاہی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میر جعفر اور عطاء اللہ خاں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ بالآخر میر جعفر نے کہا: "اس نوجوان کے متعلق آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ یہ میر مدن کا خاص آدمی ہے۔"

عطاء اللہ خاں نے کہا: "میں اسے جانتا ہوں اور آپ نے کل جن خدشات کا اظہار کیا تھا۔ وہ کسی حد تک درست ثابت ہو رہے ہیں۔ معظم علی کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ حکومت کے جاسوس ہمارے متعلق کافی چوکس ہیں۔ معظم علی آپ کو میرا دشمن سمجھتا ہے اور اس نے مجھے آپ کے متعلق خبردار رہنے کا مشورہ دیا ہے۔"

میر جعفر کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا۔ "آپ نے کہیں اسے اعتماد میں لینے کی کوشش تو نہیں کی؟"

نہیں میر صاحب! میں اتنا بیوقوف تو نہیں ہوں۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ حکومت ہمارے عزائم کے متعلق کس حد تک باخبر ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مرشدآباد میں میرے متعلق کوئی خطرناک اطلاع نہیں پہنچی۔ تاہم یہ آپ کی بدقسمتی ہے کہ آپ کو ہر جگہ شک کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہمیں اب تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ فوج کے افسر میرے ساتھ ہیں۔ صوبیدار نے اگر ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا۔ تو وقت آنے پر اس کے گھر

کا محاصرہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اِس نوجوان سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر اسے بروقت ہمارے ارادوں کا علم ہو گیا تو ہمارے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ میرے نزدیک ہر آدمی کے ضمیر کی ایک قیمت ہے۔ لیکن معظم علی اس سے مستثنیٰ ہے، وہ پوری قوت کے ساتھ ہماری مخالفت کرے گا اور سرحدی اضلاع کی چوکیوں کے کماندار کی حیثیت سے اس کی مخالفت ہمارے لیے کافی مشکلات پیدا کر دے گی۔"

میر جعفر نے کہا: "لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ اسے سرحد تک پہنچنے کا موقع دیا جائے؟"

"نہیں، یہ ضروری نہیں۔"

میر جعفر نے کہا۔ "لیکن موجودہ حالات میں اس پر ہاتھ ڈالنا ہمارے لیے خطرناک ہوگا!"

"ہم اس پر ہاتھ ڈالے بغیر اسے سرحد تک پہنچنے سے روک سکتے ہیں۔ میر حبیب کا ایلچی اگر واپس نہیں چلا گیا تو اسے یہ پیغام دے کر روانہ کر دیجیے کہ معظم علی کل صبح یہاں سے روانہ ہوگا اور یہ وہی نوجوان ہے جس نے مرزا حسین بیگ کی حویلی کی حفاظت کی تھی۔ آپ اسے یہ بھی بتا دیں کہ وہ فوج کے بغیر یہاں سے روانہ ہوگا۔ مرشدآباد سے صرف آٹھ سپاہی اس کے ہمراہ آئے ہیں اور یہی اس کے ساتھ یہاں سے جائیں گے۔ کٹک اور سرحدی علاقے کے درمیان کئی مقامات ایسے ہیں۔ جہاں میر حبیب کے آدمی اس کو آسانی کے ساتھ گرفتار کر سکتے ہیں۔ اگر یہ تجویز کامیاب ہو گئی تو ہمارے راستے سے ایک پتھر ہٹ جائے گا اور ہم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔"

میر جعفر نے کہا: "لیکن وہ فوج کے بغیر یہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگا؟"

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: "میں اُسے بتا چکا ہوں کہ اس کے حصے کی فوج بردوان اور میدناپور کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔"

میر جعفر نے کہا: "آپ میری توقع سے زیادہ دور اندیش ہیں۔"

عطاء اللہ خاں نے مسکرا کر کہا۔ "میر صاحب! یہ سب آپ کی صحبت کا اثر ہے۔"

اگلے روز صبح کی نماز کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے سے باہر

نکل رہے تھے کہ میر جعفر دروازے کے قریب ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”معظم علی ٹھہرو!“ اس نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

معظم علی نے گھوڑا روکا۔ میر جعفر نے کہا: ”مجھے تمھاری فرض شناسی کا اعتراف ہے لیکن میرے خیال میں یہ بہتر ہوتا کہ تم فوج کو ساتھ لے کر جاتے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر راستے میں تمھیں کوئی خطرہ پیش آیا تو یہ آٹھ آدمی تمھاری حفاظت کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”میری حفاظت کا مسئلہ اس قدر اہم نہیں اور میں فوج کے انتظار میں یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا۔“

”بہرحال تمھیں راستے میں بہت محتاط رہنا چاہیئے۔ گزشتہ چند دنوں میں مرہٹے یہاں سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر کئی بستیاں لوٹ چکے ہیں۔“ یہ کہہ کر میر جعفر، معظم علی کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”معظم علی بنگال کی فوج کا بہترین سپاہی ہے اور اس کی جان بہت قیمتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی حفاظت کا خیال رکھو!“

معظم علی نے کہا: ”آپ میری فکر نہ کریں۔“

○

دن بھر سفر کرنے کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھیوں نے رات کے وقت ایک گاؤں کے زمیندار کے ہاں قیام کیا۔ اگلے دن دوپہر کے وقت وہ ایک ندی کے قریب تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے رکے۔ ندی کے دونوں کناروں پر گھنے درخت تھے۔ کچھ دیر سستانے کے بعد وہ ظہر کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ درختوں کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے کھول رہے تھے کہ اچانک چاروں طرف درختوں کی آڑ سے قریباً پچاس مسلح مرہٹے نمودار ہوئے۔ معظم علی کے ساتھیوں کے لیے گھوڑوں پر سوار ہونے یا بندوقیں سنبھالنے کا موقع نہ تھا۔ پچاس آدمی بندوقیں سیدھی کیے ان کے گرد گھیرا ڈال رہے تھے۔

ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا: ”اب مقابلے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمھارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم ہتھیار پھینک دو!“

معظم علی چند لمحے تذبذب اور پریشانی کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے اپنی بندوق اور تلوار پھینک دی اور اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جو اپنے لباس سے اس جتھے کا سردار معلوم ہوتا تھا آگے بڑھا اور اس نے معظم علی سے مخاطب ہو کر سوال کیا۔ ”تم کہاں سے آئے ہو؟“

معظم علی نے جواب میں کہا: ”تمھیں ہم سے سوالات پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟“

مرہٹہ سردار بولا: ”ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ چلو۔“

”کہاں“؟

مرہٹہ سردار نے جواب دیا: ”قیدیوں کو ایسے سوالات کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ میں تمھاری جان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ لیکن اگر کسی نے راستے میں بھاگنے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔“

مرہٹہ سردار کے اشارے سے چند آدمیوں نے آگے بڑھ کر ان کے گھوڑوں اور اسلحہ پر قبضہ کر لیا اور ان کے ہاتھ رسّوں سے جکڑ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد معظم علی اور اس کے ساتھی قیدیوں کی حیثیت میں کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ایک ہفتہ جنگلوں اور پہاڑوں میں سفر کرنے کے بعد انھیں سرحد کے پار ایک گاؤں کے قریب مرہٹہ فوج کا پڑاؤ دکھائی دیا۔ معظم علی اور اس کے ساتھی مرہٹہ سپاہیوں کی بندوقوں کے پہرے میں پڑاؤ عبور کرنے کے بعد گاؤں میں پہنچے اور پھر ایک تنگ گلی سے گزر کر ایک قلعہ نما حویلی کے اندر داخل ہوئے۔ مرہٹہ فوج کے چند سپاہی انھیں دیکھتے ہی جمع ہو گئے۔

معظم علی کو گرفتار کرنے والے دستے کے سردار نے ان کے افسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”سپہ سالار کا حکم ہے کہ ان قیدیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے۔ انھیں کوئی تکلیف

نہ دی جائے۔ لیکن اگر کوئی بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے کسی توقف کے بغیر پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ سپہ سالار کچھ عرصہ یہاں نہیں آسکیں گے۔ پھر اس نے معظم علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ بنگال کی فوج کے ایک بڑے افسر ہیں اور سپہ سالار کی ہدایت ہے کہ ان کا خاص خیال رکھا جائے۔"

افسر نے اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "انھیں لے جاؤ اور کوٹھریوں کے اندر بند کر دو۔ فی الحال ایک کوٹھری میں دو قیدی بند کیے جائیں۔"

معظم علی نے آگے بڑھ کر افسر سے سوال کیا: "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہم کس کی قید میں ہیں؟"

اس نے بے رخی سے جواب دیا: "ایک قیدی کو ایسے سوالات پوچھنے کا حق نہیں۔"

پھر وہ سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "انھیں اکبر خاں کے ساتھ بڑی کوٹھری میں رکھو۔"

پہریدار، قیدیوں کو حویلی کے ایک طرف لے گئے۔ معظم علی کے آٹھ ساتھیوں کو چار کوٹھریوں میں بند کر دیا اور اس کے بعد انھوں نے ایک کشادہ کوٹھری کا دروازہ کھولا اور معظم علی کو اندر داخل ہونے کے لیے کہا۔

معظم علی کوٹھری کے اندر داخل ہوا اور پہریداروں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ کچھ دیر کوٹھری کے درمیان بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ کواڑ کے دراڑ سے سہ پہر کے سورج کی کرنیں اندر آ رہی تھیں۔ فرش پر کھجور کی چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ معظم علی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ معاً اسے کوٹھری کے ایک تاریک کونے میں ایک اور قیدی دکھائی دیا جو بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

معظم علی نے کہا: "بھائی معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے کچھ عرصہ کے لیے ہمیں ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیا ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں!"

قیدی جلدی سے اٹھ کر آگے بڑھا اور معظم علی کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا:

"میرا نام اکبر خاں ہے۔ مجھے مرہٹوں کی قید میں تقریباً تین مہینے گزر چکے ہیں۔ پہلے مجھے

اس حویلی کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت تھی، لیکن کوئی بیس دن ہوتے میں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی، جب سے مجھے یہاں بند کر دیا گیا ہے۔"

معظم علی حیرانی کے عالم میں قیدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی بارہ چودہ سال کا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں اور سرخ و سپید چہرے کے تیکھے نقوش میں غایت درجے کی جاذبیت تھی۔

"تمھیں کس جرم میں قید کیا گیا ہے؟" معظم علی نے سوال کیا۔

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" کمسن لڑکے نے قدرے برہم ہو کر جواب دیا۔

معظم علی نے کہا: "تمھاری صورت بتا رہی ہے کہ تم کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو اور یہاں کیسے پہنچے ہیں؟"

لڑکے نے اس سوال کے جواب میں مختصراً اپنی سرگزشت شروع کر دی:

"میرا گاؤں روہیلکھنڈ میں ہے۔ عظیم خاں میرے ابا جان تھے اور وہ اپنے علاقے کے سردار تھے۔ انھیں گھوڑوں کی تجارت کا شوق تھا۔ وہ راجپوتانہ سے گھوڑے خرید کر کبھی لکھنؤ اور کبھی حیدرآباد میں فروخت کیا کرتے تھے۔ میرا بڑا بھائی عام طور پر ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اس سال میں نے ضد کی اور وہ اس کی بجائے مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارے ساتھ چالیس مسلح نوکر تھے اور ہم راجپوتانہ سے ڈیڑھ سو گھوڑے خرید کر لکھنؤ کی طرف آ رہے تھے۔ راستے میں اودھ کی سرحد سے تھوڑی دور مرہٹوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ اباجان [illegible] کے ساتھ پندرہ اور آدمی لڑائی میں شہید ہو گئے۔ سات آدمی مرہٹوں نے گرفتار کر لیے اور باقی بھاگ گئے۔ مرہٹوں کے سردار نے باقی آدمیوں کو تلاشی لے کر چھوڑ دیا، لیکن مجھے اپنے پاس رکھا اور چند دن بعد میر حبیب کے پاس بھیج دیا۔ میر حبیب نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔ وہ کبھی کبھی چند دن کے لیے یہاں آتا ہے اور ہمیشہ مجھ سے یہ پوچھتا ہے۔ تمھیں میرے سپاہیوں نے کوئی تکلیف تو نہیں دی؟ اگر میں کسی کی شکایت کرتا ہوں تو اس کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔ لیکن جب میں اس سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے میرے گھر پہنچا

دیا جائے تو وہ یہ جواب دیتا ہے کہ جب میں روہیلکھنڈ پر حملہ کروں گا۔ تو تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ تمہارے باپ نے اپنے گھر میں بے شمار دولت جمع کر رکھی ہے اور جب تم مجھے اپنے گھر کا خزانہ تلاش کرنے میں مدد دو گے تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ جب میں اس سے یہ کہتا ہوں کہ ہمارے گھر میں کوئی خزانہ نہیں تو وہ کہتا ہے کہ اگر تمہیں خزانے کا علم نہیں تو ہم تمہارے بھائی سے پوچھ لیں گے۔ میر حبیب کو یہ یقین تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس لیے مجھے اس حویلی کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔ ایک شام میں یہاں سے بھاگ گیا اور ساری رات جنگلوں اور پہاڑوں میں گھومتا رہا۔ لیکن صبح کے وقت چند سوار مجھے دوبارہ گرفتار کر کے یہاں لے آئے۔ خوش قسمتی سے میر حبیب یہاں نہیں تھا اور اس کے سپاہیوں نے مجھے اس کوٹھڑی میں بند کرنے کے علاوہ کوئی اور سزا نہ دی۔ جب میر حبیب آیا تو اس نے مجھے دو دن بھوکا رکھنے کی سزا دی۔ اب پہریدار مجھے صبح شام تھوڑی دیر کے لیے اس کوٹھڑی سے باہر نکالتے ہیں۔ لیکن ان کا پہرہ اس قدر سخت ہوتا ہے کہ اب میرے لیے دوبارہ بھاگ نکلنا ممکن نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ بھی ان کی قید میں ہیں۔ بتائیے آپ یہاں کیسے پہنچے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں کٹک سے اڑیسہ کے ایک سرحدی قلعے کی طرف آ رہا تھا۔ راستے میں مرہٹوں نے اچانک حملہ کیا اور مجھے گرفتار کر لیا۔ تم سے باتیں کرنے سے پہلے مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں میر حبیب کی قید میں ہوں۔"

◆

چھ ماہ بعد ایک صبح چار مسلح سپاہیوں نے معظم علی کو کوٹھڑی سے نکالا اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ معظم علی کوئی سوال کیے بغیر ان کے ساتھ چل دیا۔ سپاہی ایک کمرے کے دروازے پر رکے اور معظم علی ان کے اشارے پر کمرے کے اندر داخل ہوا۔

یہ کشادہ کمرہ بیش قیمت ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ اور دو آدمی قالین پر بیٹھے

شطرنج کھیل رہے تھے۔ یہ دونوں اپنے لباس سے مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا اور دوسرا جس کی عمر چالیس سال سے اوپر معلوم ہوتی تھی دوہرے جسم کا ایک بارعب آدمی تھا۔

"تمہارا نام معظم علی ہے؟" قوی ہیکل آدمی نے سوال کیا۔

"ہاں!" معظم علی نے جواب دیا۔

"میں نے اپنے سپاہیوں کو ہدایت کر رکھی ہے کہ کسی قیدی کو بلاوجہ تکلیف نہ دی جائے۔ تمہیں میرے آدمیوں سے کوئی شکایت تو نہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "ایک قیدی کو کیا شکایت ہو سکتی ہے۔"

"ہم کوشش کریں گے کہ تم اپنی قید کو بہت زیادہ محسوس نہ کرو۔ میں بہادروں کی عزت کرتا ہوں اور تم مرزا حسین بیگ کے گھر کی حفاظت میں اپنی جرأت و ہمت کا ثبوت دے چکے ہو۔"

معظم علی نے کہا: "آپ کی معلومات قابلِ داد ہیں۔"

"تمہارے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے مجھے کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہ تھی۔ اب یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ سرحد کا نائب فوجدار اور اس کے آٹھ ساتھی کہیں روپوش ہو گئے ہیں اور میرے لیے یہ معلوم کرنا مشکل نہ تھا، کہ یہ نائب فوجدار کون ہے۔"

"میں اپنی ذات کے لیے آپ سے کسی نیکی کی توقع نہیں رکھتا۔ لیکن اگر آپ میر حبیب ہیں تو میں بنگال سے آپ کی دشمنی کی وجوہات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

میر حبیب نے جواب دیا: "میں کسی کا دوست ہوں نہ دشمن۔ میری دلچسپی صرف بنگال کے حکمران اور امراء کی دولت سے ہے۔"

"لیکن آپ مرہٹوں کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں!"

"مرہٹے مجھے دولت حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تم کسی دولتمند

آدمی کے بیٹے نہیں ہو۔ لیکن اگر تم مجھے کسی دولت مند آدمی کے گھر کا پتہ بتا سکو تو مجھے تمہارا تعاون حاصل کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا"۔

معظم علی نے غصے سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا: "میں تمھیں ایک ہی گھر کا راستہ بتا سکتا ہوں اور وہ مرشد آباد کا قیدخانہ ہے"۔

میر حبیب نے بے پروائی سے جواب دیا: "قیدخانے میں وہ جاتے ہیں جن کی کسی کو بھی ضرورت نہ ہو اور میں بدترین حالات میں بھی بنگال کے حکمران کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اسے میری ضرورت ہے۔ تم ایک ذہین آدمی ہو لیکن میں حیران ہوں کہ تم نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ تم بڑے بڑے امراء کی تجوریوں پر پہرہ دے کر بنگال کی کوئی خدمت کر رہے ہو؟"

"اگر تمھیں اس بات کا افسوس ہے کہ تمھارے سپاہی حسین بیگ کے گھر سے نامراد واپس آئے تھے تو میں تمھاری غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں۔ مرزا حسین بیگ کے گھر میں روپیہ نہیں بلکہ عزت تھی جس کی حفاظت ہر شریف آدمی کا فرض تھا"۔

میر حبیب نے جواب دیا: "میں نے اونچے طبقے میں کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو عزت کے معنی سمجھتا ہو۔ وہ صرف دولت اور حکومت کے معنی سمجھتے ہیں"۔

معظم علی نے کہا: "میں جس بنگال کی عزت اور آزادی کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں وہ صرف امیروں اور حکمرانوں کا بنگال نہیں ہے میرا وہ بنگال ہے جسے لاکھوں مسلمان اپنا اور اپنی آنے والی نسلوں کا وطن سمجھتے ہیں۔ یہ میرا گھر ہے اور میں اسے چوروں، راہزنوں اور انسانیت کے دشمنوں سے محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں"۔

"نوجوان! میں تمھارے خیالات کی داد دیتا ہوں۔ لیکن جس بنگال کو میں جانتا ہوں، اس کے محافظ میرے نزدیک باہر کے رہزنوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ دن بہت جلد آ رہا ہے جب تم بنگال کے متعلق سوچنے کی بجائے اپنے متعلق سوچنا زیادہ بہتر سمجھو گے۔ صرف

علی وردی خاں کے آنکھیں بند کرنے کی دیر ہے۔ اس کے بعد تم بنگال کے متعلق سوچنا بھی حماقت سمجھو گے۔ اتنی دیر شاید تم میری قید میں رہو۔ لیکن اگر اس سے پہلے ہی تمھارے خیالات میں کوئی تبدیلی آجائے تو میں بڑی خوشی کے ساتھ تمھارا تعاون قبول کر دوں گا۔ پھر ہم بنگال کے متعلق نہیں بلکہ اپنے متعلق سوچیں گے۔ بالکل مرشد آباد کے امراء کی طرح، جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو علی وردی خاں کا واحد جانشین سمجھتا ہے۔ ان لوگوں کے نعروں کے جواب میں ہمیں بھی یہ نعرہ لگانے کا حق ہے کہ بنگال ہمارا ہے"۔

معظم علی نے کہا: "اگر آپ کی رفاقت سے مجھے دلی کا تخت ملنے کی امید ہو تو بھی میں ایک قیدی کی حیثیت میں گمنامی کی موت کو ترجیح دوں گا"۔

میر حبیب نے کہا: "انسان کے خیالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میں چند ماہ یا چند برس انتظار کر سکتا ہوں۔ اس دوران میں میری کوشش یہ ہو گی کہ یہاں تمھیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ تمھیں حویلی کے اندر گھومنے پھرنے کی پوری آزادی ہو گی، لیکن اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمھارے ہاتھ پاؤں کاٹنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا ــــ اب تم جا سکتے ہو"۔

معظم علی کمرے سے باہر نکلا اور مسلح سپاہیوں کے ساتھ جو دروازے کے باہر کھڑے تھے چل دیا۔

◆

علی وردی خاں کی افواج، میدناپور کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ میر جعفر علی وردی خاں کے خیمے میں داخل ہوا۔ اور تین دفعہ فرشی سلام کرنے کے بعد ادب سے کھڑا ہو گیا۔ علی وردی خاں کی مسند کے پیچھے دو محافظ ننگی تلواریں لیے کھڑے تھے۔ میر جعفر چند ثانیے خوف و اضطراب کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر علی وردی خاں نے کہا: "ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ عطاء اللہ خاں یہاں حاضر ہونے سے کیوں پس و پیش کر رہا ہے؟"

"عالیجاہ! مجھے معلوم نہیں"۔

علی وردی خاں نے کہا: ہمارے خلاف کوئی سازش تمہارے علم کے بغیر نہیں ہوتی"۔

"عالیجاہ! اگر مجھے اس کی سازش کا علم ہوتا تو میں اس کا سر لے کر حضور کی خدمت میں پیش ہوتا۔"

"اس کے سر کے متعلق ہم بعد میں سوچیں گے۔ فی الحال ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس کے عزائم کیا ہیں اور اسے ہماری حکم عدولی کی جرأت کیسے ہوئی اور معظم علی کا آج تک کیوں پتہ نہیں چلا؟"

"عالیجاہ! کٹک کا صوبیدار آپ کو تمام حالات سے آگاہ کر چکا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ فوج کے تمام بڑے بڑے افسر عطار اللہ خاں کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ اگر اس کی نیت بری ہو تو بھی وہ موجودہ حالات میں حضور کے خلاف کوئی سازش نہیں کر سکتا۔ وہ صرف اپنی جان کے خوف سے حضور کی خدمت میں حاضر ہونے سے پس و پیش کرتا ہے۔ میں نے حضور کا حکم ملتے ہی معظم علی کے متعلق تحقیقات کی تھی۔ بدقسمتی سے جس دن وہ کٹک سے روانہ ہوا تھا۔ میں وہیں تھا اور میں نے اسے یہ کہا تھا، کہ تم آٹھ آدمیوں کے ساتھ سفر کرنے کی بجائے فوج کا انتظار کر لو اور میرے اس مشورے کی وجہ یہ تھی کہ مجھے سرحد کے آس پاس مرہٹوں کی سرگرمیوں کی اطلاع مل چکی تھی۔ لیکن معظم علی ایسے مشورے سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ مارا گیا ہے یا قید ہو گیا ہے۔ بہرحال وہ کٹک سے میرے سامنے روانہ ہوا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ عطار اللہ خاں نے اس کے خلاف کوئی سازش کی ہو لیکن یہ ثابت کرنا آسان نہیں"۔

علی وردی خاں نے قدرے نرم ہو کر سوال کیا" عطار اللہ خاں کے متعلق تمھارا کیا مشورہ ہے؟"

"عالیجاہ! میرا خیال ہے وہ ڈر کے مارے حضور کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ میری یہ درخواست ہے کہ حضور کوئی قدم اٹھانے سے پہلے مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دیں اگر

اس کی نیت خراب ہے تو ممکن ہے میں اسے یہ سمجھا سکوں کہ تمھاری سازش طشت ازبام ہو چکی ہے اور تمھارے بچاؤ کی اب یہی ایک صورت ہے کہ تم کسی توقف کے بغیر حضور کی قدمبوسی کے لیے حاضر ہو جاؤ۔"

علی وردی خاں نے کہا: اسے میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں، اگر تم اسے راہِ راست پر لا سکتے ہو تو اسے کہو کہ وہ استعفا دے کر سیدھا مرشدآباد چلا جائے"۔

"عالیجاہ! اگر میں اسے یہ یقین دلا سکوں کہ آپ نے اس کی جان بخشی کا وعدہ کیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مرشدآباد جانا اپنی خوش قسمتی سمجھے گا۔"

"تمھیں غداروں کی سفارش نہیں کرنی چاہیئے۔ بہرحال اگر وہ راست پر آجائے تو ہم اس کے لیے معمولی سزا کافی سمجھیں گے"۔

* * *

رات کے وقت عطار اللہ خاں اپنی قیام گاہ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے نوکر نے اسے جگایا اور کہا ——— "میر جعفر تشریف لائے ہیں اور اسی وقت آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انھیں ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔ ان کے ساتھ فوج کے دو افسر بھی ہیں"۔

عطار اللہ خاں پریشانی کی حالت میں لباس تبدیل کیے بغیر نیچے اترا اور ملاقات کے کمرے میں داخل ہوا۔ میر جعفر نے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا!

"تم جا کر سپاہیوں کے آرام کا بندوبست کرو، میں ابھی آتا ہوں"۔

فوجی افسر اٹھ کر باہر نکل گئے اور میر جعفر نے عطار اللہ خاں سے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی۔ لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کو بروقت خبردار کیا جائے"۔

وہ ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عطاء اللہ خاں کچھ دیر انتہائی پریشانی اور اضطراب کی حالت میں جعفر کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئے ہیں۔ مجھے میدناپور میں علی وردی خاں کی آمد کی اطلاع ملتے ہی یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہمارے کسی ساتھی نے انھیں ہمارے ارادوں سے خبردار کر دیا ہے۔"

میر جعفر نے کہا: "مجھے اس بات کا یقین نہیں۔ لیکن آپ سے ایک غلطی ضرور ہوئی ہے اور وہ یہ کہ آپ علی وردی خاں کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتے۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میدناپور میں علی وردی خاں کی غیر متوقع آمد کے بعد ہماری سازش کی کامیابی کے امکانات بہت محدود ہو چکے ہیں۔ اس کے لشکر کا مقابلہ کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اگر وہ کٹک پہنچ گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی فوج کے بیشتر سپاہی اپنی شکست کو یقینی سمجھ کر اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ آپ کے لیے اب ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ یہ کہ استعفا دے کر مرشدآباد روانہ ہو جائیں۔ میں نے علی وردی خاں کو آپ کی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی اور انھوں نے یہ کہا تھا کہ اگر آپ مستعفی ہو کر مرشدآباد چلے جائیں تو آپ پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔"

عطاء اللہ خاں کچھ دیر پھٹی پھٹی نگاہوں سے میر جعفر کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا:

"علی وردی خاں نے آپ سے بھی استعفے کا مطالبہ کیا ہے؟"

"نہیں اور اگر آپ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تو شاید یہ صورت پیدا نہ ہوتی۔"

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: "میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی بجائے مرہٹوں کی پناہ لینا بہتر سمجھتا ہوں۔ میر صاحب آپ یوں ہی گھبرا گئے ہیں۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو میں اسی وقت فوج کو کوچ کا حکم دیتا ہوں۔ میر حبیب سرحد سے زیادہ دور نہیں۔ ہمیں اس کی پناہ لے کر علی وردی خاں کے ساتھ جنگ کے لیے تیاری کا وقت مل

جائے گا۔"

میر جعفر نے جواب دیا: "میں یہ تمام باتیں سوچنے کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں۔ میر حبیب ایک ڈاکو ہے۔ اور اس کی دوستی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بنگال کے اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھانے کی امید پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہے اور وہ بھی اسی صورت میں جب کہ اسے آپ کی کامیابی کا یقین ہو۔ لیکن جب آپ ایک شکست خوردہ آدمی کی حیثیت میں اس کے پاس جائیں گے تو وہ آپ کو چند ٹکوں کے عوض میں علی وردی خاں کے ہاتھ فروخت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ آپ اگر مستعفی نہ ہوئے تو بھی علی وردی خاں آپ کو سبکدوش کر دے گا۔ اس لیے میرا دوستانہ مشورہ یہی ہے کہ آپ ابھی انھیں یہ لکھیں کہ مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ میں آپ کا اعتماد کھو چکا ہوں اور میرے مخالفین آپ کو بدظن کرنے کے لیے میرے متعلق اس قسم کی افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ میں آپ کے خلاف بغاوت کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ ان حالات میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں مستعفی ہو جاؤں اور آپ سے یہ درخواست کروں کہ مجھے مرشدآباد میں اپنی زندگی کے باقی ایام گزارنے کی اجازت دی جائے لیکن اگر آپ کو کسی وقت میری نیک نیتی کا یقین آ جائے تو مجھے ہر وقت اپنی خدمت کے لیے تیار پائیں گے۔"

عطاء اللہ خاں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: "میر صاحب آپ کو یقین ہے کہ استعفا دینے کے بعد مرشدآباد جانا میرے لیے خودکشی کے مترادف نہیں ہوگا؟"

"نہیں! بلکہ مجھے یہ یقین ہے کہ آپ کو مرشدآباد پہنچتے ہی علی وردی خاں کا یہ پیغام ملے گا کہ ہمارے تمام شکوک دور ہو چکے ہیں اور تمھیں فلاں عہدہ پر مامور کیا جاتا ہے۔"

عطاء اللہ خاں نے کہا: "مجھے یقین نہیں آتا کہ میں اتنی جلدی بازی ہار چکا ہوں۔"

میر جعفر نے تسلی دیتے ہوئے کہا: "میرے دوست آپ نے بازی نہیں ہاری۔

علی وردی خاں اپنی عمر کی آخری منزل میں قدم رکھ چکا ہے۔ مستقبل ہمارا ہے اور ہم چند مہینے یا چند برس اور انتظار کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو اپنی شکست کا اعتراف کرنے یا ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دینے نہیں آیا بلکہ یہ مشورہ دینے کے لیے آیا ہوں کہ آپ ہتھیار اٹھانے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کریں۔"

عطاء اللہ خاں نے کہا: "میر صاحب! جب ہم اپنے مستقبل کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے تو آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ مجھے ایسی صورت حالات کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ اب اگر آپ کا یہی مشورہ ہے تو میں استعفا دینے کے لیے تیار ہوں لیکن استعفے کا جواب آنے تک میرا یہاں رہنا ضروری ہوگا۔ پھر اگر علی وردی خاں نے مجھے مرشدآباد جانے سے منع کر دیا تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"آپ کو جواب کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ استعفا میرے حوالے کریں اور کسی تاخیر کے بغیر مرشدآباد روانہ ہو جائیں۔ علی وردی خاں کو مطمئن کرنا میرا کام ہوگا۔"

عطاء اللہ خاں نے اٹھ کر دروازے کے قریب جا کر نوکر کو آواز دی اور کاغذ اور قلم لانے کا حکم دیا۔ اور پھر میر جعفر کی طرف متوجہ ہو کر بولا "میر صاحب! استعفے کا مضمون لکھنے کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"بہت اچھا! میں بولتا جاؤں گا اور آپ لکھتے جائیں۔"

دوسرے روز علی الصباح عطاء اللہ خاں مرشدآباد کا رخ کر رہا تھا اور اس کی روانگی کے چند دن بعد میر جعفر میدناپور پہنچ کر علی وردی خاں سے یہ کہہ رہا تھا۔ "عالیجاہ! خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری باتوں میں آکر استعفا دے دیا، ورنہ اس کے عزائم بہت خطرناک تھے، مرشدآباد میں وہ حضور کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتا۔ ہمارے جاسوس ہر وقت اس کی نگرانی کے لیے موجود ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی نادان دوست نے بہکایا تھا۔ اب اگر حضور کی اجازت ہو تو میں اسے یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ حضور والا شان نے

تمھارا استعفا منظور کر لیا ہے۔ سابقہ غلطیوں کے بارے میں تم سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ لیکن آئندہ کے لیے تمھیں بے حد محتاط رہنا چاہیے!"

اور علی وردی خاں اس کے جواب میں کہہ رہا تھا: "ہاں، اور اسے یہ بھی لکھ دو کہ اس کی سابقہ فوجی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کے گزارے کے لیے ایک معقول وظیفہ دیا جائے۔"

ساتواں باب

میر حبیب کی قید میں معظم علی کے لیے زندگی صبح و شام کے ایک بے کیف تسلسل کا نام تھی۔ اسے بنگال کے حالات کا کوئی علم نہ تھا۔ قید کی تنہائی میں اکبر خاں اس کے لیے ایک بہت بڑا سہارا بن چکا تھا۔ وہ اکثر اپنے اپنے خاندان، عزیزوں اور دوستوں کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایک ذہنی کرب کے باعث معظم علی کئی کئی گھنٹے خاموش رہتا اور اکبر خاں اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا۔ "بھائی جان! آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ خدا ہماری مدد کرے گا اور ہم بہت جلد ان ظالموں کی قید سے آزاد ہو جائیں گے۔ آپ کہتے تھے کہ خدا اپنے بندوں کی دعائیں ضرور سنتا ہے۔ میں ہر وقت آپ کی رہائی کے لیے دعائیں مانگا کرتا ہوں۔ آپ کہتے تھے خدا اپنے بندوں کے صبر کا امتحان لیتا ہے۔ لیکن آج آپ مغموم ہیں۔"

جب مسکرانے کی کوشش کے باوجود اکبر خاں کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں تو معظم علی خواب و خیال کی دنیا سے نکل کر اسے تسلی دینے کی ضرورت محسوس کرتا۔ "اکبر میں اپنے متعلق نہیں۔ بلکہ اپنی قوم اور اپنے وطن کے متعلق سوچ رہا تھا کاش مجھے معلوم ہوتا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

پھر وہ آپس میں بار بار کی ہوئی باتیں دہراتے اور حال کی مایوسیوں کے اندھیروں میں مستقبل کی امیدوں کے چراغ جلانے کی کوشش کرتے۔ اکبر خاں اپنے وطن کے حسین اور دلکش مناظر بیان کرتا اور معظم علی اسے مرشد آباد کی ان گلیوں اور مکانوں کے متعلق بتاتا جہاں وہ بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ پھر وہ قید سے آزاد ہونے کے بعد ایک دوسرے کا وطن دیکھنے کا وعدہ کرتے۔

اکبر خاں اپنی عمر کے عام بچوں کی نسبت کہیں زیادہ سنجیدہ اور ذہین تھا۔ وہ معظم علی کو اس حویلی کے اندر اور باہر مرہٹوں کے کیمپ کے تمام حالات بتا چکا تھا۔ فرار کی کوشش سے پہلے جب اسے اِدھر اُدھر گھومنے کی آزادی تھی وہ پڑاؤ کے متعلق تمام معلومات حاصل کر چکا تھا۔ وہ معظم کو بتا چکا تھا کہ مرہٹے گاؤں کے اصل باشندوں کو نکالنے کے بعد ان کے مکانات پر قبضہ کر چکے ہیں بیشتر مکانات ان کے گھوڑوں کے لیے اصطبلوں کا کام دیتے ہیں اور بعض مکانات میں انھوں نے گولہ بارود اور رسد کے ذخیرے جمع کر رکھے ہیں، پہریداروں کی ٹولیاں دن رات گاؤں کی گلیوں میں گشت کرتی ہیں۔ گاؤں کے باہر چاروں طرف مرہٹہ سپاہیوں کے خیمے ہیں۔ اس حویلی کی چار دیواری کے اندر بھی بعض کوٹھڑیوں کے تہہ خانوں میں رسد اور بارود کے ذخیرے جمع ہیں۔

اکبر خاں سے متعدد سوالات پوچھنے کے بعد معظم علی کو اپنی کوٹھڑی سے باہر ہر دیوار، ہر گلی اور ہر مکان کا نقشہ حفظ ہو چکا تھا صبح شام انھیں تھوڑی دیر ہوا خوری کے لیے قید خانے سے باہر نکالا جاتا۔ معظم علی حویلی کے اندر دوسرے قیدیوں کے علاوہ کبھی کبھی اپنے ساتھیوں سے ملتا لیکن مسلح پہریدار ہر وقت اس کے سر پر موجود ہوتے اور اسے کسی سے بات کرنے کا موقع نہ دیتے۔

ایک دن اکبر خاں فرار ہونے کے متعلق اسے اپنی نئی تجویز بتا رہا تھا۔ معظم علی دیر تک اس کی باتیں سنتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "اکبر خاں تمھیں معلوم ہے کہ بھاگنے کی ناکام کوشش ہمارے لیے کس قدر خطرناک ثابت ہوگی۔ پھر میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتا۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر تم اس کوٹھڑی سے باہر رہ کر گرد و پیش کے حالات معلوم کر سکو تو شاید

ہم بھاگنے کے متعلق کوئی بہتر تجویز سوچ سکیں۔ میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ اگر تم نے ہوشیاری کا ثبوت دیا تو ممکن ہے ہم بہت جلد رہا ہو جائیں۔"

اگلے دن پہریدار کھانا لے کر آیا تو معظم علی نے اس سے کہا: "میں میر حبیب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

پہریدار نے جواب دیا: "وہ یہاں نہیں ہیں جب وہ آئیں گے تو آپ کی درخواست پہنچادی جائے گی۔"

معظم علی انتہائی بے چینی سے میر حبیب کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ روزانہ صبح اٹھتا اور پہریدار سے پوچھتا مگر اسے نفی میں جواب ملتا۔

کوئی دس ماہ انتظار کے بعد پہرے داروں کے ایک افسر نے اس کے پاس آکر اطلاع دی کہ میر حبیب تشریف لاتے ہیں اور آپ کی درخواست ان تک پہنچا دی گئی ہے لیکن ابھی تک انھوں نے مجھے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

معظم علی نے مایوسی اور بے بسی کی حالت میں چند دن اور گذارے۔ ایک دن اچانک اس کی کوٹھری کا دروازہ کھلا اور میر حبیب فوج کے دو افسروں اور چار مسلح سپاہیوں کے ہمراہ کوٹھڑی کے اندر داخل ہوا۔ معظم علی اور اکبر خان اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

میر حبیب نے سوال کیا: "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں یہ سمجھتا تھا کہ اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود آپ ایک بہادر آدمی ہیں۔ لیکن بہادری اور بے رحمی میں بہت فرق ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس معصوم بچے نے کیا گناہ کیا ہے۔ اور آپ اسے کب تک قید میں رکھنا چاہتے ہیں؟"

میر حبیب نے جواب دیا: "ایک قیدی کو دوسرے قیدی کی سفارش کا حق نہیں۔ تاہم ذاتی طور پر میری یہ خواہش نہ تھی کہ اکبر کو کوٹھری میں بند کیا جائے۔ لیکن اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو [illegible] کی خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس کی شکل دیکھ کر رحم آگیا تھا۔"

معظم علی نے اکبر خاں کی طرف دیکھا اور اس نے آگے بڑھ کر میر حبیب کا دامن پکڑتے ہوئے کہا: "خدا کے لیے میرا قصور معاف کر دیجیے۔ اب اگر میں بھاگنے کی کوشش کروں تو مجھے گولی مار دیجیے۔"

میر حبیب نے کہا: "میرا خیال تھا کہ تم یہاں خوش ہو۔"

"نہیں! نہیں!" اکبر خاں نے جواب دیا۔ "میں کھلی ہوا میں رہنا چاہتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا: "اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا وطن کس سمت ہے لیکن اگر یہ بھاگ بھی جائے تو آپ کے لیے کون سے خطرے کا باعث ہو سکتا ہے؟"

میر حبیب نے کہا: "دیکھو اکبر۔ میں تمھیں ایک اور موقع دیتا ہوں۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی تو تمھیں باقی تمام عمر اس تہہ خانے میں رکھا جائے گا۔ جہاں دوپہر کے وقت بھی روشنی نہیں پہنچتی۔"

پھر وہ پہریداروں کی طرف متوجہ ہوا۔ "اسے لے جاؤ! لیکن اس کا اچھی طرح خیال رکھو!"

اکبر خاں ایک پہریدار کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میر حبیب دروازے کے قریب پہنچ کر اچانک مڑا اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "میرا خیال تھا کہ تم اپنے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"اپنے متعلق میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک ایسے شخص کی قید میں ہوں۔ جس سے رحم یا انصاف کی درخواست کرنا بے سود ہے اور میں اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں جب انصاف کی تلوار میرے ہاتھ میں ہوگی۔"

میر حبیب غصے میں آنے کی بجائے مسکرایا اور اس نے سوال کیا: "جب انصاف کی تلوار تمھارے ہاتھ میں ہوگی تو تم کیا کرو گے؟"

"میں آپ کو اس سے بہتر کوٹھری دوں گا اور آپ کے ساتھ کوئی ایسا قیدی نہیں رکھوں گا۔ جس کی مظلومیت اور بے کسی کے احساس سے آپ اپنی تکالیف بھول جائیں۔"

"تم بیوقوف ہو۔ ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔" میر حبیب یہ کہہ کر نکل گیا۔

* * *

قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے حویلی کے صحن میں تین چھولداریاں نصب تھیں۔ درمیانی چھولداری ذرا بڑی تھی جس میں قیدیوں کے محافظوں کا جمعدار رہتا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو چھولداریوں میں آٹھ سپاہی رہتے تھے۔ گرمی کے موسم میں قیدیوں کے محافظ دن کے وقت ان چھولداریوں میں پناہ لیتے تھے۔ لیکن رات کے وقت وہ قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے دروازوں کے سامنے کھلی فضا میں آرام کرتے تھے۔ دو دو پہریداروں کی چار ٹولیاں رات کے وقت باری باری قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے گشت کرتیں اور شام سے صبح تک ہر تین گھنٹے کے بعد پہرہ بدلتا تھا۔ اس چوکی کے دوسرے محافظ جن کی تعداد عام طور پر پچاس ساٹھ کے لگ بھگ ہوتی تھی بڑے دروازے کی طرف دیوار کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں اور بانس کے چھپروں میں رہتے تھے۔

میر حبیب نے اکبر خاں کو معظم علی کی کوٹھڑی سے نکال کر قیدیوں کے محافظ سپاہیوں کے جمعدار کے سپرد کر دیا تھا اور اسے تاکید کی تھی کہ اکبر خان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ جمعدار ایک مرہٹہ تھا اور اس کا نام مرلی دت تھا۔ مرلی دت بے حد موٹا تھا۔ وہ سر سے گنجا تھا اور اس کے سیاہ چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ دو سال قبل وہ میر حبیب کی فوج کے اچھے سپاہیوں میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن ایک لڑائی میں زخمی ہونے کے باعث اس کی بائیں ٹانگ بیکار ہو چکی تھی۔ اپنے ماتحت سپاہیوں کے ساتھ وہ بڑی سختی کے ساتھ پیش آتا تھا لیکن اکبر خاں کے ساتھ اس کا برتاؤ نسبتاً بہتر تھا۔ اس نے اکبر خاں کو قید خانے کی کوٹھڑی سے نکالنے کے بعد اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس سے پہلے بھی تمھیں کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ لیکن تم نے بھاگنے کی کوشش کی۔ میر صاحب نے تمھیں ایک موقع اور دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب بھی تمھیں کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی تو تمھارا

انجام بہت بُرا ہوگا۔"

اکبر خاں نے انتہائی معصومیت کے انداز میں جواب دیا۔ "جی میں آئندہ کوئی شرارت نہیں کروں گا۔"

"تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ تم کوئی شرارت نہ کرو!"

چند دنوں کے اندر اکبر خاں، مرلی دت کے لیے ایک کارآمد نوکر بن چکا تھا۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر چھولداری میں جھاڑو دیتا۔ اس کا بستر درست کرتا اور کبھی کبھی اس کے کپڑے بھی دھلواتا۔ سپاہی اس پر اس لیے خوش تھے کہ پہلے اس قسم کے تمام کام انھیں کرنے پڑتے تھے۔

مُرلی دت کو بانسری بجانے اور اس سے زیادہ سننے والوں سے داد حاصل کرنے کا شوق تھا۔ لیکن اس کے چند سپاہیوں کے علاوہ جو اسے ایک مجبوری سمجھ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے، قلعے میں کسی اور کو اس کے اس فن سے دلچسپی نہ تھی بلکہ دوسرے سپاہی اور افسر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ بانسری بجانے کے علاوہ اسے گانے کا بھی شوق تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کی آواز اس کی صورت سے بھی زیادہ کریہہ تھی۔

اکبر خاں کو اس کی کمزوری کا علم تھا اور وہ جی کھول کر اسے داد دیا کرتا تھا۔ وہ کہتا "چچا مرلی دت! آپ! آپ تو کمال کرتے ہیں۔ میں نے کسی اور کو اتنی اچھی بانسری بجاتے نہیں دیکھا۔"

اور وہ جواب دیتا۔ "اسے سمجھنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور تم ان سب سے زیادہ سمجھدار ہو۔"

"چچا مرلی دت! آپ کی آواز بھی بہت اچھی ہے۔ کاش میں بھی اس طرح گا سکتا!"

اور مرلی دت خوش ہو کر کہتا۔ "گانے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے بیٹا!"

آہستہ آہستہ اکبر خاں پر مرلی دت کا اعتماد بڑھتا گیا۔ اسے حویلی کے اندر گھومنے کی آزادی

تھی۔ جب قیدیوں کو تھوڑی دیر کے لیے کوٹھڑیوں سے باہر نکالا جاتا تو وہ کسی نہ کسی بہانے ان کے پاس چلا جاتا۔ پہریداروں کی موجودگی میں اسے عام طور پر معظم علی سے باتیں کرنے کا موقع نہ ملتا۔ لیکن جب کبھی سپاہیوں کی توجہ دوسری طرف ہوتی تو وہ آہستہ سے کوئی بات کہہ کر نکل جاتا۔

جب سپاہی قیدیوں کے لیے کھانا لے کر آتے تو وہ آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے کبھی روٹیوں کی ٹوکری اور کبھی پانی کا مٹکا پکڑ لیتا۔ آہستہ آہستہ پہریدار اس سے اس قسم کے کام لینے کے عادی ہوتے گئے۔ پانچ چھ ہفتوں کے بعد یہ حالت تھی کہ جب قیدیوں کو کھانا پہنچانے کا وقت آتا تو سپاہی اسے کبھی کنویں سے پانی اور کبھی لنگر خانے سے کھانا لانے کے لیے کہتے۔

کوٹھڑیوں کے تالوں کی چابیاں مرلی دت ہمیشہ اپنے قبضے میں رکھتا تھا۔ رات کے وقت قیدیوں کو کھانا دینے کے بعد وہ چابیوں کا گچھا چھولداری کے اندر ایک لکڑی کے صندوق میں بند کر دیتا تھا۔ اور صندوق کے تالے کی چابی جو ایک دھاگے میں بندھی ہوئی تھی۔ اپنے گلے میں ڈال لیتا تھا۔ پہریدار ہر صبح قیدیوں کو باہر نکالنے کے لیے مرلی دت سے چابیاں لینے آتے تھے۔ ایک دن اس کی طبیعت ذرا خراب تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے اکبر خاں کو صندوق کی چابی دیتے ہوئے کہا: "جاؤ تم نکال دو!"

یہ ابتدا تھی اور اس کے بعد اکبر خاں مستقل طور پر یہ کام اپنے ذمے لے چکا تھا۔

ایک رات ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ مرلی دت کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر بانسری بجاتا رہا اور اس کے بعد اپنی موٹی اور بھدی آواز میں اکبر خاں کو چند گیت سنانے کے بعد لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد گہری نیند میں اس کے خراٹے جو حویلی کے تقریباً ہر سپاہی اور افسر کے لیے موضوعِ بحث بن چکے تھے۔ اکبر خاں کو پریشان کر رہے تھے۔ پچھلے پہر جب بارش تھم گئی تو اکبر خاں نے اپنی کھاٹ چھولداری سے باہر نکال لی۔

دو پہریدار گشت کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا: "کیوں اکبر خاں کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں! چچا مرلی دت بین بجا رہا ہے اور مجھے نیند نہیں آتی۔"

پہریدار نے اس کے قریب آ کر کہا: "میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ توپ کی آواز بھی اس سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو مرلی دت کے ساتھ چھولداری میں رہنے کی بجائے تہ خانے میں رہنا زیادہ پسند کرتا۔ لیکن دیکھو یہ بات کہیں اس سے نہ کہہ دینا!"

دوسرے سپاہی نے کہا: "بھئی اکبر خاں! سچ بتاؤ تمھیں واقعی ان کا گانا پسند ہے؟ آدھی رات تک وہ بانسری بجاتے رہے اور پھر جب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اب تھوڑی دیر سونے کے لیے وقت مل جائے گا تو تم گانے کے لیے اصرار کرنے لگے۔"

"ان کا گانا مجھے بہت پسند ہے۔" اکبر خاں نے کھاٹ پر لیٹتے ہوئے جواب دیا۔

صبح کے وقت پہریدار نے اکبر خاں کو جگایا اور کہا: "جاؤ چابیاں لے آؤ!"

اکبر خاں آنکھیں ملتا ہوا چھولداری میں داخل ہوا تو مرلی دت بدستور خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے مرلی دت کو جگانے کی بجائے آگے بڑھ کر اطمینان سے دھاگے کی گرہ کھولی اور اس کے گلے سے چابی اتار لی۔ پھر اس نے صندوق کا تالا کھولا اور قید خانے کی چابیوں کا گچھا لے کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کھاٹ چھولداری کے اندر لے آیا۔ اور اس پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔

اچانک اسے مرلی دت کی آواز سنائی دی "اکبر خاں! اکبر خاں!! بہت دیر ہو گئی۔ جاؤ پہریداروں کو چابیاں دے آؤ۔ مجھے رات نیند نہیں آئی۔"

اکبر خاں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

مرلی دت نے اپنے گلے اور سینے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد بدحواس ہو کر کہا: "ارے میری چابی کہاں گئی؟"

اکبر خاں نے اپنے گلے سے چابی اتار کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا: "لیجیے، میں نے

پہریداروں کو چابیاں نکال دی ہیں۔ آپ گہری نیند سو رہے تھے۔ اس لیے میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"تم بہت شریر ہو!" مرلی دت نے چابی کا دھاگا اپنے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ تم نے اچھا کیا کہ مجھے جگایا نہیں۔"

"اب مجھے نیند آرہی ہے۔" اکبر خاں نے کھاٹ پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

اس واقعہ سے چند ہفتے بعد صبح کے وقت قیدیوں کو کوٹھریوں سے باہر نکالا گیا تو اکبر خاں نے موقع پاکر معظم علی سے کہا: "میر حبیب کل کہیں چلے گئے ہیں۔ ان کی غیر حاضری میں پہرہ سخت نہیں ہوتا۔ بادل آرہے ہیں اگر آج رات بارش شروع ہو گئی تو آپ تیار رہیں۔"

* * *

شام کے وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، مرلی دت چھولداری کے باہر کھاٹ پر بیٹھا اطمینان سے بانسری بجا رہا تھا۔ اکبر خان پہریداروں کے ساتھ قیدیوں کو کھانا تقسیم کرنے کے بعد اس کے پاس آیا اور اس نے چابیوں کا گچھا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "چچا مرلی دت آج بہت گرمی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بعض راگنیاں بارش لے آتی ہیں۔ آپ کو کوئی ایسا راگ آتا ہے؟"

مرلی دت نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "راگ آدمی کے لیے ہوتے ہیں۔ بادلوں کے لیے نہیں۔" اور پھر بانسری بجانے میں مصروف ہو گیا۔

اکبر خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "چچا مرلی دت چابیاں اندر رکھ آؤں؟"

مرلی دت نے جواب دینے کی بجائے اپنے گلے سے صندوق کی کنجی نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اکبر خاں چابیوں کا گچھا لے کر اندر چلا گیا۔ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ چند ثانیے توقف کے بعد اس نے چابیوں کا گچھا صندوق کے پیچھے رکھ دیا۔ پھر اس نے صندق کھولا اور اس کا ڈھکنا زور سے بند کرنے کے بعد تالا کھولا اور اس کا ڈھکنا زور سے بند کرنے کے بعد تالا لگا کر باہر نکل آیا۔

"کیسے بیوقوف ہو۔" مرلی دت نے جھنجھلا کر کہا "تم میرا صندق توڑ ڈالو گے۔"

اکبر خاں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "چچا! اندر بہت گرمی ہے۔ دیکھو مجھے پسینہ آرہا ہے۔"

"آج بارش ضرور آئے گی۔" اس نے اکبر خاں کے ہاتھ سے چابی لے کر گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

اکبر خاں مرلی دت کے سامنے دوسری کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آس پاس لیٹے ہوئے سپاہیوں کو آواز دے کر کہا: "بھئی یہاں آؤ! آج چچا مرلی دت کمال کر رہے ہیں۔" اور سپاہی مرلی دت کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی بجائے اس کے عتاب سے بچنے کے لیے اپنی اپنی کھاٹ گھسیٹ کر اس کے اردگرد بیٹھ گئے۔

مُرلی دت نے کہا: "راگ سمجھنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ اب ذرا غور سے سنو۔" اور وہ کوئی ایک گھنٹہ انتہائی بیچارگی کی حالت میں بیٹھے رہے۔ اچانک بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ بادل گرجا اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔

اکبر خاں نے کہا: "چچا مرلی دت بارش آگئی اُٹھیے، آپ کی کھاٹ اندر کر دوں؟" اور وہ بدستور بانسری بجاتا ہوا چھولداری کے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر اکبر خاں اور مرلی دت چھولداری کے اندر اپنی اپنی کھاٹ پر لیٹے رہے مرلی دت بانسری بجانے کی بجائے ایک انتہائی ناقابل برداشت لے میں گا رہا تھا۔ وہ گاتے گاتے سو گیا اور پھر اس کے خراٹے تاریک رات کی ہولناکی میں اضافہ کرنے لگے۔

اکبر خاں کے دل کی دھڑکنیں دوبارہ تیز ہونے لگیں۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ بالآخر اٹھا اور کھاٹ سے اتر کر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل فرش پر چلتا ہوا صندق کے پاس پہنچا۔

صندوق کے پیچھے چابیوں کے گچھے کو ہاتھ لگنے سے ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور اس کے جسم میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ لیکن مرلی دت کے خراٹوں کے تسلسل نے اس کے توہمات دور کر دیئے۔ وہ مڑا اور اسی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا چھولداری کے دروازے پر کھڑا ہو کر باہر جھانکنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد پانی اور کیچڑ میں دو پہریداروں کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اکبر خاں دبے پاؤں معظم علی کو کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔ وہ کوٹھڑی کے تالے میں یکے بعد دیگرے مختلف چابیاں لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سپاہیوں کے قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دینے لگی۔ وہ دروازے کے ساتھ چمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ خوف و ہراس کے باعث اس کی یہ حالت تھی کہ اسے اپنا سانس بھی بار محسوس ہوتا تھا۔ بجلی کی ایک ہلکی سی چمک ان تمام منصوبوں کو خاک میں ملا سکتی تھی جو اس نے مہینوں کے غور و فکر کے بعد تیار کیے تھے۔

ایک پہریدار اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ "بھئی چلیں اپنی چھولداری کے اندر۔ یہ طوفان بہت خطرناک ہے۔"

"ٹھہرو! میں ابھی آتا ہوں۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"کہاں جا رہے۔ . ."

"ذرا جمعدار صاحب کا حال دیکھ آؤں۔"

ایک پہریدار، اکبر خاں سے صرف پانچ قدم کے فاصلے پر رک گیا اور دوسرا مرلی دت کی چھولداری کی طرف بڑھا۔

چند منٹ بعد وہ ہنستا ہوا واپس آیا اور بولا "چلو بھئی! جمعدار جی کو اس وقت دنیا کی کوئی خبر نہیں ہے۔ ہم اپنی چھولداری کے اندر بیٹھتے ہیں۔ یہ کمبخت خود بھینسے کی طرح سوتا ہے اور ہمیں ایسی بارش میں بھی سر چھپانے کی اجازت نہیں دیتا۔ آخر ان کوٹھڑیوں میں کون سا خزانہ ہے

جسے کوئی لوٹنے آئے گا۔ ہم تھوڑی دیر بعد چکر لگاتے رہیں گے۔"

وہ چلے گئے۔

اکبر خاں نے اطمینان کا سانس لیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک چابی لگ گئی۔ اس نے تالا نکال کر کنڈی اتاری اور آہستہ سے کواڑ کے پٹ اندر کی طرف دھکیل دیئے۔

"بھائی جان! بھائی!!" اس نے دبی زبان میں کہا۔

"اکبر آہستہ بولو!" معظم علی نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

اکبر خاں نے کہا۔ "پہریدار چھولداری کے اندر چلے گئے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ آؤ ہمارے ساتھی انتظار کر رہے ہوں گے۔"

اکبر خاں نے چابیوں کا گچھا اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "یہ لیجیے! اگر پہریدار جلدی نہ آ گئے تو ہم تمام کوٹھڑیاں کھول سکتے ہیں۔"

معظم علی نے باہر نکل کر دروازے کو کنڈی لگا دی اور کہا۔ "اس کا تالا کہاں ہے؟"

اکبر خاں نے جواب دیا۔ "وہ میں نے چھت پر پھینک دیا ہے۔"

معظم علی جلدی سے آگے بڑھ کر دوسری کوٹھڑی کا تالا کھولنے میں لگ گیا۔ چند چابیاں آزمانے کے بعد اس نے تالا کھول لیا۔ کوٹھڑی کے اندر اس کے دو ساتھی منتظر تھے۔ اس نے چابیوں کے گچھے کی رسی کھینچ کر توڑ ڈالی اور اپنے ساتھیوں کو چابیاں تقسیم کرتے ہوئے کہا "تم ان چابیوں سے جن کوٹھڑیوں کے تالے کھول سکو وہاں سے قیدیوں کو نکال کر میری کوٹھڑی میں جمع کرو۔ اور دروازے اسی طرح بند کرتے جاؤ۔ اور دیکھو ہمیں اپنے ساتھیوں کے علاوہ دوسرے قیدیوں کو بھی یہاں سے نکالنا ہے۔"

چند منٹ میں معظم علی کے آٹھ ساتھیوں کے علاوہ بارہ اور قیدی اس کی کوٹھڑی میں جمع ہو چکے تھے۔ صرف آخری سرے پر تین کوٹھڑیاں باقی تھیں جن کے اندر پانچ پانچ قیدی بند تھے۔

معظم علی نے ایک کوٹھڑی کا تالا ابھی کھولا ہی تھا کہ اکبر خاں بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا: "پہریدار گشت کے لیے آرہے ہیں۔"

معظم علی نے جلدی سے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور اکبر خاں کا بازو پکڑ کر فوراً اندر داخل ہوگیا قیدی دروازے پر منتظر تھے۔ معظم علی نے دروازہ بند کرتے ہوئے اکبر خاں سے دریافت کیا۔

"پہریدار کتنے ہیں؟"

"صرف دو" اس نے جواب دیا۔

معظم علی نے کوٹھڑی کے قیدیوں سے مخاطب ہو کر کہا: "تم میں سے تین مضبوط آدمی میرے ساتھ آجائیں۔ ہم پہریداروں کو چیخ پکار کا موقع دیے بغیر اس کوٹھڑی میں بند کریں گے۔ لیکن یاد رکھو۔ تمھاری ذرا سی کوتاہی ہمارا تمام منصوبہ خاک میں ملا دے گی۔"

اس کے بعد معظم علی نے دروازہ کھول دیا۔ تھوڑی دیر میں پہریداروں کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ جوں ہی وہ باتیں کرتے ہوئے کوٹھڑی کے سامنے پہنچے۔ معظم علی اچانک آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے ایک کا گلا دبوچ کر کوٹھڑی کے اندر گھسیٹ لایا۔ دوسرے آدمی کے منہ سے صرف "کیا ہے" نکلنے پایا تھا کہ ایک قیدی نے بڑھ کر اس کی گردن دبائی اور باقی دو نے اسے گھونسوں اور مکوں سے ادھ موا کر کے کوٹھڑی کے اندر ڈال دیا۔

تاریکی میں معظم علی کو یہ بتانے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ گرفتاروں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ کوئی ان کی قمیص پھاڑ کر ان کے منہ میں ٹھونس رہا تھا تو کوئی ان کی پگڑیاں اتار کر ان کے ہاتھ پاؤں باندھنے میں مصروف تھا۔ اور کوئی لاتوں اور مکوں سے ان کی تواضع کرنے میں لگا ہوا تھا۔

معظم علی نے کہا: "بھائی دیکھنا اندھیرے میں اپنے کسی ساتھی کو نہ مار دینا!"

پہریداروں کی بندوقوں اور تلواروں پر قبضہ کرنے کے بعد معظم علی قیدیوں کو لے کر باہر نکلا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا۔ باقی دو کوٹھڑیوں سے قیدیوں کو نکالنے میں اسے دیر

نہ لگی جب تمام قیدی معظم علی کی کوٹھڑی میں جمع ہو گئے تو اس نے اکبر خاں سے کہا: "اکبر! تم نے ہمیں قید سے نکالا ہے۔ اب باہر نکلنے کے لیے بھی ہمیں تمھاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔"

اکبر خاں نے جواب دیا: "حویلی کا دروازہ کھول کر باہر نکلنا ممکن نہیں۔ یہاں سے نکلنے کے صرف دو ہی راستے ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم یا تو پچھلی دیوار میں نقب لگائیں یا چھت پر چڑھ کر پچھواڑے کی طرف دوسری حویلی میں کود جائیں۔ پچھواڑے کی حویلی میں غلے کے گودام اور گھوڑوں کے اصطبل ہیں۔ وہاں اس وقت پندرہ بیس پہریدار ہوں گے۔ ہمارے پاس صرف دو بندوقیں اور دو تلواریں ہیں۔ میں مرلی دت کی بندوق، تلوار، پستول اور بارود کا تھیلا بھی لا کر آپ کو دے سکتا ہوں۔ لیکن اگر ہم اچانک ان خیموں پر حملہ کر کے پہریداروں کو مغلوب کر لیں تو ہم چند بندوقیں اور تلواریں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ساتھ والی حویلی کے پہریداروں کو مغلوب کرنا ہمارے لیے آسان ہوگا۔"

معظم علی نے جواب دیا: "نہیں! ہمارے لیے دوسری حویلی سے ہتھیار حاصل کرنا زیادہ آسان ہوگا۔ ان کوٹھڑیوں کی چھت زیادہ اونچی نہیں اور ہم بآسانی یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ اکبر خاں! سب سے پہلے تمھاری باری ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ!"

کوٹھڑی سے باہر نکل کر معظم علی نے دیوار کے قریب جھکتے ہوئے کہا: "تم میرے کندھے پر سوار ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔"

اکبر خان نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن اس کے ہاتھ چھت کی منڈیر تک نہ پہنچ سکے۔ معظم علی نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کے گھٹنے پکڑ کر اپنے بازو اوپر اٹھائے اور اکبر منڈیر پکڑ کر چھت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے بعد معظم علی نے اسی طرح ایک اور آدمی کو چھت پر چڑھایا اور پھر باقی تمام آدمیوں کو اسی طریقے پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ آن کی آن میں تمام آدمی چھت پر چڑھ گئے۔ نیچے آخری آدمی معظم علی تھا۔ دو آدمیوں نے اپنی پگڑیوں کا رسا بنا کر نیچے لٹکا دیا۔ معظم علی نے بڑے اطمینان

کے ساتھ کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا اور گڑیوں کے سہارے چھت پر چڑھ گیا۔

اس چھت سے آگے دوسری حویلی کے مکانات کی چھتیں قریباً ایک گز نیچی تھیں۔ معظم علی اپنے ساتھیوں کو وہیں رُکنے کا حکم دے کر موسلا دھار بارش میں گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ دوسری چھت کی منڈیر کے قریب پہنچ کر اس نے حویلی کے صحن کا جائزہ لیا۔ اس حویلی کا بیشتر حصہ تاریک تھا۔ دائیں ہاتھ کی دیوار کے درمیان ایک کشادہ ڈیوڑھی میں ایک مشعل جل رہی تھی جس کی روشنی میں ڈیوڑھی سے آگے ایک چھپر کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ چھپر کے نیچے چند آدمی کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ معظم علی نے دبی زبان میں اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور وہ آگے بڑھ کر ایک لمبی قطار میں منڈیر کے پیچھے لیٹ گئے۔ معظم علی نے پہلے اکبر خاں کو نیچے لٹکایا پھر خود منڈیر کے ساتھ لٹک کر اتر گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کے تمام ساتھی کسی دقت کے بغیر دوسری حویلی کے صحن میں پہنچ گئے۔

معظم علی نے باقی آدمیوں کو وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا اور اکبر خاں کے علاوہ تین اور ساتھیوں کے ہمراہ پانی اور کیچڑ میں احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا حویلی کے روشن حصے کی طرف بڑھا۔ چھپر کے نیچے دو چارپائیوں کے درمیان خالی جگہ میں سے گزر کر یہ لوگ ڈیوڑھی کے اندر داخل ہوئے۔ ڈیوڑھی کے اندر دو آدمی کھاٹوں پر اور سات آدمی فرش پر سو رہے تھے۔ دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ ایک مشعل جل رہی تھی۔ اور اس کے قریب ہی تیل کی کُپی پڑی ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ ایک کھاٹ کے سرہانے دیوار کے ساتھ چند بندوقیں اور بارود کی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ معظم علی نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو ان پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔ وہ فرش پر لیٹے ہوئے آدمیوں سے پاؤں بچاتے ہوئے آگے بڑھے اور بندوقیں اٹھا کر دبے پاؤں باہر نکل آئے۔

معظم علی نے مشعل اٹھائی اور اس پر کُپی سے تیل ڈالنے کے بعد واپس مڑا۔ ڈیوڑھی سے چھپر میں داخل ہونے کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کے دائیں بائیں چھ اور آدمی چارپائیوں پر سو رہے ہیں اور ان چارپائیوں سے آگے دونوں طرف چھپر کے نیچے گھوڑوں کی کھرلیاں ہیں۔ معظم علی نے مشعل بلند کر کے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا اور آن کی آن میں اس کے ساتھی آگے بڑھ کر ڈیوڑھی

کے سامنے جمع ہو گئے۔ چند آدمی معظم علی کے اشارے پر ڈیوڑھی کے اندر داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں گھوڑے بدحواس ہو کر کھلبلی مچا رہے تھے۔ چھپر کے نیچے لیٹے ہوئے تین آدمی یکے بعد دیگرے ہڑبڑا کر اٹھے۔ لیکن معظم علی کے ساتھیوں نے انھیں بندوقوں کے کندوں سے مار مار کر ڈھیر کر دیا۔ ایک پہریدار نے چیخنے کی کوشش کی لیکن کسی نے اس کا گلا دبا دیا۔ ڈیوڑھی کے اندر اور چھپر کے نیچے باقی پہریدار انتہائی پریشانی اور خوف کی حالت میں ان غیر متوقع حملہ آوروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

معظم علی نے کہا "یہ گاؤں ہمارے محاصرہ میں ہے۔ تمھارے لیے اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں اگر کسی نے شور مچانے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ تم بلا چون و چرا ہمارے حکم کی تعمیل کرو!"

تھوڑی دیر بعد معظم علی کے ساتھی پہریداروں کو ہانک کر غلّے کے ایک گودام میں بند کر چکے تھے۔ معظم علی گودام کا دروازہ بند کر رہا تھا کہ اکبر خاں بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا۔ "بھائی جان! حویلی کے پھاٹک میں قفل لگا ہوا ہے، آپ ان سے چابی لے لیں۔"

"چابی کس کے پاس ہے؟" معظم علی نے پہریداروں سے سوال کیا۔

جب ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو معظم علی نے دوبارہ کہا۔ "میں حویلی کی چابی مانگتا ہوں۔ اگر ایک منٹ کے اندر اندر چابی ہمارے حوالہ نہ کی گئی تو اس گودام کو آگ لگا دی جائے گی۔"

ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے کچھ کہے بغیر ایک چابی معظم علی کے ہاتھ میں دے دی۔

معظم علی دروازے کی کنڈی لگانے کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "دو آدمی یہاں دروازے کے پاس کھڑے رہیں اگر یہ لوگ شور مچائیں۔ تو اس حویلی کو آگ لگا دی جائے اور باقی فوراً گھوڑوں پر سوار ہو جائیں!"

حویلی کے صحن میں تین طرف دیواروں کے ساتھ چھپروں کے نیچے کوئی ڈیڑھ سو گھوڑے

ہو گیا۔ معظم علی کی کوٹھری خالی ہے "

"تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ خالی ہے " اس نے سراسیمہ ہو کر سوال کیا۔

"جناب میں نے ٹٹول کر دیکھا تو اس کا تالا غائب تھا۔ صرف کنڈی باہر سے بند تھی میں دروازہ کھول کر اندر گیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔"

مرلی دت نے سراپا فریاد بن کر چوکی کے محافظ کی طرف دیکھا اور کہا "سرکار چابیوں کا گچھا غائب ہے۔"

چوکی کے محافظ نے کچھ کہے بغیر مرلی دت کے بستر سے اس کی بانسری اٹھائی اور اسے بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔

* * *

علی وردی خاں، میدنا پور کے سرکاری محل میں مقیم تھا اور اس کی فوج شہر سے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ ایک صبح وہ محل کے کشادہ کمرے میں بیٹھا اپنے میر منشی کو درخواستوں اور مراسلوں کے جواب لکھوا رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ ایک کرسی پر سراج الدولہ بیٹھا ہوا تھا۔ محل کا داروغہ اندر داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد آگے بڑھ کر ایک مراسلہ پیش کیا۔

علی وردی خاں، میر منشی کو چند جملے لکھوانے کے بعد داروغہ کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے کہا "عالیجاہ! یہ معظم علی کی درخواست ہے اور وہ اسی وقت قدمبوسی کی اجازت چاہتا ہے۔"

"معظم علی کون ہے؟" علی وردی خاں نے مراسلہ کھولتے ہوتے سوال کیا۔

داروغہ نے جواب دیا: "عالیجاہ! یہ وہی نوجوان ہے جسے حضور نے سرحدی علاقوں کا محافظ مقرر کیا تھا وہ مدت سے لاپتہ تھا اور اب مرہٹوں کی قید سے فرار ہو کر یہاں پہنچا ہے۔"

علی وردی خاں نے جلدی سے مراسلہ کھول کر پڑھا اور داروغہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا

اسے فوراً حاضر کرو!"

داروغہ سلام کر کے باہر نکل گیا۔ اور علی وردی خاں کی نگاہیں دوبارہ مراسلے پر مرکوز ہو گئیں تھوڑی دیر بعد معظم علی کمرے میں داخل ہوا۔ علی وردی خاں نے اٹھ کر اس کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور سراج الدولہ نے اس کی تقلید کی۔ علی وردی خاں نے کہا: "ہم تمھارے متعلق مایوس ہو چکے تھے۔ بیٹھو، اور مجھے اپنی سرگذشت سناؤ!"

معظم علی، علی وردی خاں کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور اس نے مختصراً اپنی سرگزشت بیان کر دی۔

اختتام پر علی وردی خاں نے کہا: "کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ تم میر حبیب کی قید میں ہو۔ تمھاری گرفتاری یقیناً عطاء اللہ خاں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ وہ اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے ہم اسے ملک بدر کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا: "مجھے یقین ہے کہ میری گرفتاری تنہا عطاء اللہ خاں کی سازش کا نتیجہ نہ تھی اس کے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے۔"

علی وردی خاں نے جواب دیا: "سازش درحقیقت ہمارے خلاف تھی اور عطاء اللہ خاں کے جن ساتھیوں پر ہمیں شبہ تھا وہ سب فوج سے نکالے جا چکے ہیں۔ میر جعفر نے ہمیں بتایا تھا۔ کہ ان کے دل میں عطاء اللہ خاں کے متعلق کچھ شکوک پیدا ہو گئے تھے اور انھوں نے تمھیں فوج کی حفاظت کے بغیر سفر کرنے سے منع کیا تھا۔"

"عالیجاہ! انھوں نے مجھے منع ضرور کیا تھا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ابتدا سے ہی عطاء اللہ خاں کے رازدار نہیں تھے۔"

علی وردی خاں نے قدرے آزردہ ہو کر جواب دیا: "اگر وہ عطاء اللہ خاں کے رازدار بن کر ہمیں بروقت اس کے ارادوں سے باخبر نہ کرتے تو اڑیسہ میں ہمیں انتہائی خطرناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔ بہرحال اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمھاری گرفتاری کے صحیح اسباب معلوم

ہمیں اس کی دشمنی کی بجائے اس کی دوستی کی ضرورت ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "میر حبیب کی دوستی حاصل کرنے کے لیے آپ کو ایک معمولی سپاہی کی ضرورت نہیں۔ اگر موجودہ حالات مجھے ایک حقیقت پسند انسان بننے سے منع کرتے ہیں تو میرے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اپنی ملازمت سے مستعفی ہو جاؤں اور اس وقت کا انتظار کروں جب ہماری قسمت کے امین دوست اور دشمن میں تمیز کر سکیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے!"

معظم علی یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

علی وردی خاں چند ثانیے غصے — اور غصے سے زیادہ پریشانی اور اضطراب کی حالت میں معظم علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "معظم علی! میں اپنی تلوار کا لوہا پہچانتا ہوں۔ تمہارا استعفا منظور نہیں کیا جائے گا۔ ایک طویل عرصہ مرہٹوں کی قید میں رہنے کے بعد تم چھ ماہ کی رخصت کے حق دار ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم اس عرصہ میں یہ سمجھ سکو گے کہ میرا یہ اقدام صحیح تھا۔ مرہٹوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے میر حبیب کو قابو میں لانا ضروری ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

معظم علی باہر نکل گیا اور علی وردی خاں سراج الدولہ کی طرف دیکھنے لگا۔

سراج الدولہ نے کہا: "جہاں پناہ! گستاخ ہونے کے باوجود وہ ایک اچھا سپاہی ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ چھ ماہ کے بعد بھی شاید ہماری فوج میں دوبارہ آنا پسند نہ کرے۔"

علی وردی خاں مسکرایا۔ "وہ محمود علی کا بیٹا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت بھی اگر ہمیں کسی محاذ پر جانا پڑے تو وہ گھر جانے کی بجائے ہماری اگلی صف میں لڑنا پسند کرے گا۔ تم جاؤ اور اسے عزت و احترام کے ساتھ رخصت کرو۔ کسی دن وہ تمہارے ترکش کا بہترین تیر ثابت ہو گا۔"

سراج الدولہ نے کہا: "تو آپ اس سے خفا نہیں ہوئے؟"

علی وردی خاں نے مغموم لہجے میں کہا: "خفا! ایک بوڑھا اپنی لاٹھی سے، ایک سپاہی اپنی تلوار سے، ایک مصنف اپنے قلم سے اور ایک فرمانروا اپنے عصائے حکمرانی سے کیونکر خفا ہو سکتا ہے۔ ہاں مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ جب وہ انتہائی اشتعال کی حالت میں بول رہا تھا تو میں نے آگے بڑھ کر سینے سے کیوں نہ لگا لیا۔ کاش! میرے اسلحہ خانے میں اس قسم کی تلواریں اور بھی ہوتیں اور میں ہر محاذ پر ہر دشمن کو للکار سکتا۔ لیکن جب تمہارا وقت آئے گا تو مجھے یقین ہے کہ بنگال کے حالات اس سے مختلف ہوں گے۔ معظم علی جیسے نوجوانوں کے دل کی دھڑکنوں میں ایک نئی قوم جنم لے گی۔ تم جاؤ اور بخشی سے کہو کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو قید کے زمانے کی پوری تنخواہ ادا کر دی جائے۔ ہم ایک ہفتہ تک مرشد آباد پہنچ جائیں گے اور وہاں میں یہ کوشش کروں گا کہ اسے تمہاری محافظ فوج کا کماندار مقرر کر دیا جائے۔"

سراج الدولہ کمرے سے نکلا اور محل کے دروازے پر معظم علی سے جا ملا اور اس نے اسے آواز دے کر روکتے ہوئے کہا: "مجھے آپ سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

"فرمائیے!" معظم علی نے کہا۔

سراج الدولہ نے کہا: "میں یہاں سے سیدھا ہگلی جا رہا ہوں اور شاید کچھ عرصہ مرشد آباد نہ آ سکوں۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ مستعفی ہونے کے متعلق اپنا ارادہ تبدیل کر سکیں تو سیدھے میرے پاس آئیں۔ مجھے وہاں اپنی فوج کے لیے قابل اعتماد افسروں کی ضرورت ہے۔"

"آپ مجھے قابل اعتماد سمجھتے ہیں؟" معظم علی نے مسکرا کر سوال کیا۔

سراج الدولہ نے جواب دیا: "اگر میں آپ کو قابل اعتماد نہ سمجھتا تو دوڑتا ہوا آپ کے پیچھے نہ آتا۔ چلیے ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

معظم علی اس کے ساتھ محل کے ایک کمرے میں داخل ہوا اور وہ قریباً دو گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ رخصت ہوتے وقت سراج الدولہ نے اس کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کرتے

دیئے کہا: "کیا میں یہ توقع رکھوں کہ چند دنوں یا چند ہفتوں کے بعد آپ میرے پاس پہنچ جائیں گے؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں آپ سے صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ اگر مستعفی ہونے کے متعلق میں نے اپنا ارادہ تبدیل کیا تو کسی اور کے پاس جانے کی بجائے میں سیدھا آپ کے پاس آؤں گا۔"

سراج الدولہ نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ آپ کا ارادہ بہت جلد بدل جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی بارہ سواروں کے ہمراہ مرشد آباد کا رخ کر رہا تھا۔ اور ان میں سے آٹھ وہ تھے جو معظم علی کے ساتھ قید ہوئے تھے۔ باقی راستے کی مختلف منازل پر اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

میدنا پور چند گھنٹے قیام کے دوران میں معظم علی اپنے اور مرزا حسین بیگ کے گھر کی خیریت معلوم کر چکا تھا۔ اس کے محلے کا ایک سپاہی اسے یہ بتا چکا تھا کہ اس کا باپ مرشد آباد میں ہے۔ اس کا بھائی یوسف اس کے روپوش ہونے کے بعد عظیم آباد سے مرشد آباد آگیا تھا اور اب میر مدن نے ڈھاکہ کی فوجداری سنبھالنے کے بعد اسے اپنے پاس بلا لیا ہے۔ فضل بیگ مرشد آباد میں ہے۔

مرشد آباد سے میر مدن کی تبدیلی کی خبر اس کے لیے پریشان کن تھی۔ لیکن فوج کے ایک افسر سے تبادلۂ خیالات کے بعد اسے معلوم ہوا تھا کہ میر مدن نے مرشد آباد کے بعض امراء بالخصوص میر جعفر سے شدید اختلافات کے باعث، علی وردی خاں سے یہ درخواست کی تھی کہ اسے ڈھاکہ بھیج دیا جائے۔

آٹھواں باب

آمنہ بالا خانے کے ایک کمرے میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پڑھ رہی تھی کہ صابر بھاگتا ہوا زنانہ مکان کے صحن میں داخل ہوا اور پوری طاقت کے ساتھ چلانے لگا: "معظم علی آگیا! معظم علی آگیا!"

آمنہ قرآن بند کر کے اٹھی، لیکن اس میں بولنے یا چلنے کی ہمت نہ تھی۔ نیچے خادمہ صابر کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھی۔ "کہاں ہے معظم علی؟ خدا کے لیے بتاؤ وہ کہاں ہے؟" لیکن وہ اس کی طرف توجہ دیئے بغیر بالا خانے کی طرف منہ اٹھا کر بدستور چلا رہا تھا: "بی بی جی! بی بی جی!! معظم علی آگیا۔ معظم علی آگیا!"

معظم علی، اکبر خاں کے ساتھ صحن میں داخل ہوا اور خادمہ بھاگ کر بالا خانے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی: "بی بی جی! معظم علی۔۔۔!" اس نے پوری قوت سے چلانے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز حلق میں بیٹھ گئی۔

آمنہ لڑکھڑاتی ہوئی دریچے کی طرف بڑھی۔ معظم علی نے اس کی طرف دیکھا، اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ چند ثانیے بعد وہ اپنی ماں کے سامنے کھڑا تھا اور وہ ایک سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"امی جان میں آگیا ہوں!" معظم علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔

“میرا لال۔ میرا بیٹا!” اس نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ معظم علی بے اختیار ماں کے ساتھ لپٹ گیا۔ آمنہ اب بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کر رہی تھی۔

“میرے چاند۔ میرے لال! مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے۔ میں ہر روز تمھیں خواب میں دیکھا کرتی تھی۔

“ابا جان کہاں ہیں؟” معظم علی نے سوال کیا۔

“وہ مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے۔” یہ کہہ کر آمنہ خادمہ کی طرف متوجہ ہوئی جو دروازے میں کھڑی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ “تم جلدی سے ناشتہ تیار کرو اور صابر سے کہو ان کے ابا جان کو اطلاع دے دے۔”

“صابر جا چکا ہے۔” خادمہ یہ کہہ کر نیچے چلی گئی۔

ماں اور بیٹا قالین پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ “تم کہاں تھے بیٹا؟”

“امی جان میں مرہٹوں کی قید میں تھا۔” معظم علی یہ کہہ کر اٹھا اور دریچے کے قریب جا کر واز دی: “اکبر خاں! تم نیچے کیوں کھڑے ہو اوپر آ جاؤ!”

“اکبر خان کون ہے؟” ماں نے سوال کیا۔

معظم علی نے مسکرا کر جواب دیا۔ “امی جان آپ کے لیے ایک اور بیٹا لایا ہوں۔ وہ میرے ساتھ قید تھا اور میں اسی کی وجہ سے رہا ہوا ہوں۔”

اکبر خاں جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور اس نے معظم علی کی ماں کو سلام کیا۔

آمنہ نے جواب دیا۔ “جیتے رہو بیٹا۔ آؤ بیٹھ جاؤ!”

کوئی دس منٹ بعد نیچے صحن سے محمود علی کی آواز آئی۔ “کہاں ہے معظم علی؟”

معظم علی اٹھ کر بھاگتا ہوا نیچے اترا اور بے اختیار اپنے باپ کے ساتھ لپٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بالاخانے کے اسی کمرے میں بیٹھ کر آنسوؤں میں بھیگی ہوئی مسکراہٹوں کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی، ماں اور باپ کے ان گنت سوالات کے جواب میں اپنی سرگذشت سنا رہا تھا۔

صابر نے سیڑھیوں سے آواز دی۔ “مرزا حسین بیگ آئے ہیں۔”

“انھیں اوپر لے آؤ۔” محمود علی نے کہا۔

“ان کے ساتھ اور آدمی بھی ہیں۔” صابر نے جواب دیا۔

“اچھا انھیں دیوانخانے میں بٹھاؤ، ہم آتے ہیں۔”

جب معظم علی اور اس کا باپ نیچے اترنے لگے تو اکبر خاں ان کے پیچھے ہو لیا۔ آمنہ نے کہا۔ “تم کہاں جاؤ گے بیٹا! تم یہیں بیٹھو۔ میں تم سے تمام واقعات سننا چاہتی ہوں۔”

مرزا حسین بیگ اور محلے کے دوسرے لوگوں سے ملاقات کرنے کے بعد معظم علی واپس آیا تو اکبر خاں قالین پر پڑا گہری نیند سو رہا تھا۔ خادمہ ناشتا لے کر آئی تو معظم علی، اکبر خاں کو جگانے لگا۔ لیکن ماں نے کہا۔ “بیٹا اسے نہ جگاؤ۔ میں اسے ناشتا کھلا چکی ہوں۔”

محمود علی نے جلدی سے ناشتا کر کے اٹھتے ہوئے کہا: “معظم! مجھے آج دفتر میں چند ضروری کام ہیں۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ اتنی دیر تم اپنی ماں سے باتیں کرو۔ میں یوسف کو ابھی پیغام بھیجتا ہوں کہ وہ بھی ایک دو دن کی چھٹی لے کر گھر آ جائے۔”

محمود علی کے جانے کے بعد معظم دیر تک اپنی ماں کے مختلف سوالات کے جواب دیتا رہا۔ بالآخر اس نے پوچھا۔ “امی جان! فرحت اور اس کی امی کیسی ہیں؟”

“وہ بہت خوش ہیں بیٹا۔” ماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

“کیا ہوا امی جان؟” معظم علی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

"کچھ نہیں بیٹا!" ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "تم مرزا صاحب سے مل آئے ہونا؟"

"ہاں امی جان! لیکن افضل مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ مرزا صاحب کہتے تھے وہ کل شکار پر چلا گیا ہے، میرا خیال ہے میں چچی جان کو سلام کر آؤں۔"

"ہاں بیٹا ضرور جاؤ۔"

معظم علی نے پوچھا۔ "امی جان فرحت کی امی آپ سے ملا کرتی ہیں نا؟"

"ہاں بیٹا! کبھی میں ان کے یہاں چلی جاتی ہوں اور کبھی وہ ہمارے یہاں آجایا کرتی ہیں۔ پہلے فرحت بھی ان کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے وہ گھر سے نہیں نکلتی۔"

"امی جان! کیا بات ہے، آپ مغموم کیوں ہوگئیں؟"

"کچھ نہیں بیٹا!" ماں نے آبدیدہ ہوکر کہا۔ "کاش تم دو مہینے پہلے آجاتے۔"

اور معظم علی انتہائی اضطراب کی حالت میں ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

ماں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "بیٹا! فرحت کی منگنی ہوچکی ہے۔"

ایک ثانیے کے لیے معظم علی نے محسوس کیا کہ کائنات کے نظام میں یکایک ٹھہراؤ آ گیا ہے اور زمانے کی ایک ٹھوکر نے اسے امیدوں، آرزوؤں، امنگوں اور ولولوں کے حسین اور سدا بہار نخلستانوں سے نکال کر ایک بے آب و گیاہ صحرا کی بھیانک وسعتوں میں پھینک دیا ہے۔

"فرحت کی منگنی ہوچکی ہے۔" یہ چند الفاظ معظم کے لیے حال اور مستقبل کی اس داستان کا عنوان تھے جو نغموں، مسکراہٹوں اور قہقہوں سے خالی تھی۔ وہ رنگین سپنوں، دلفریب نظاروں اور دلکش نغموں کی حسین وادیوں سے نکل کر ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ جس کی صبحیں سورج کی ضیاء پاشیوں سے اور جس کی راتیں ستاروں کی مسکراہٹوں اور چاند کے قہقہوں سے محروم تھیں۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن ماں کے لیے یہ مسکراہٹ ہزاروں آنسوؤں سے زیادہ دردناک تھی۔ معظم علی نے سنبھل کر کہا۔ "امی جان آپ فرحت کی منگنی پر خوش نہیں ہیں؟"

اور ماں نے جواب دینے کی بجائے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"بیٹا!" اس نے اس کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "مرزا حسین بیگ کو تمہارا بہت خیال تھا۔ لڑکے والے کئی بار ان کے یہاں آئے۔ لیکن وہ ہر بار انکار کرتے رہے۔ پھر جب وہ تمہارے متعلق مایوس ہوگئے تو انھوں نے ہاں کر دی۔ اس بات کو ایک مہینہ ہوا ہے۔ میں منگنی کے دن ان کے ہاں گئی تھی۔ شہر کے امراء کی بیویاں وہاں جمع تھیں۔ میں نے جب فرحت کی ماں کو مبارک باد دی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے کہا: بہن خدا کو منظور نہ تھا۔ ورنہ مرزا صاحب یہ فیصلہ کر چکے تھے، کہ فرحت آپ کی ہے۔ اب آپ میری بیٹی کے لیے دعا کریں۔" اس کے بعد جب میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ فرحت میری بیٹی ہے اور وہ نوجوان جس کے ساتھ اس کی منگنی ہو رہی ہے، صرف عابدہ کا ہی نہیں بلکہ میرا بھی داماد ہے۔"

جس وقت ماں بیٹے آپس میں یہ باتیں کر رہے تھے۔ فرحت اپنے مکان کے ایک کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک بے تکلف سہیلی جس کا نام ناصرہ تھا، کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے دبے پاؤں فرحت کے پیچھے جا کر دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کرلیں اور کہا: "بھلا بتاؤ میں کون ہوں؟"

"چھوڑو ناصرہ مجھے تنگ نہ کرو۔" فرحت نے مغموم آواز میں جواب دیا۔

"غلط! بالکل غلط!!" ناصرہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "میں ناصرہ نہیں ہوں میں معظم علی ہوں۔ سنتی ہو میرا نام معظم علی ہے!"

"ناصرہ خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔" اس نے انتہائی مغموم لہجے میں کہا۔

ناصرہ قدرے نادم سی ہوکر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ فرحت کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز دیکھ

کراس نے کہا: "فرحت تمھیں پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ تمھارے اباجان اب اپنا خیال بدل دیں گے۔"

"نامرہ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کہو۔ میں اباجان کو سارے ملک میں رسوا کرنے کی بجائے اس مکان کی چھت سے چھلانگ لگا دینا آسان سمجھتی ہوں۔"

"لیکن معظم علی آگیا ہے۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔"

فرحت نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا "معظم علی آگیا ہے لیکن فرحت اس کے لیے مرچکی ہے۔ فرحت اس دن مرگئی تھی جس دن اس نے منگنی کا جوڑا پہنا تھا اور اب میرے والدین مجھے معظم علی کے لیے قبر سے نکالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

* * *

معظم علی کے دل میں تنہائی اور بے کسی کا احساس بڑھتا گیا۔ گھر سے باہر مرشدآباد کی گلیاں اسے اداس نظر آتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ حسین بیگ کے پاس جاتا۔ حسین بیگ اس کے ساتھ انتہائی شفقت سے پیش آتا۔ اس کے ساتھ افضل کا برتاؤ بھی نہایت دوستانہ تھا۔ لیکن معظم علی ہر ملاقات کے بعد اپنے دل پر ایک بوجھ محسوس کرتا ہوا گھر واپس آتا۔ پانچ دن بعد یوسف علی آیا اور دو دن گھر رہ کر واپس چلا گیا۔

قید سے رہا ہونے کے بعد اس نے اکبرخان سے وعدہ کیا تھا کہ مرشدآباد پہنچتے ہی میں تمھیں روہیلکھنڈ پہنچانے کا انتظام کردوں گا۔ اور اکبرخاں نے جب دس دن اس کے گھر ٹھہرنے کے بعد اپنے وطن جانے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے کہا: "اکبرخاں تمھیں پریشان نہیں ہونا چاہیئے میں خود تمھارے ساتھ جانے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔"

اکبرخاں کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور اس نے کہا: "بھائی جان! اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو میں چند ہفتے اور یہاں ٹھہر سکتا ہوں۔"

چوتھے روز علی الصباح معظم علی، اکبرخاں کے ساتھ روانہ ہوا۔ چند دن سفر کرنے کے

بعد وہ اودھ کی سرحد سے دس میل دور روہیلکھنڈ کے چرواہوں اور کسانوں کی چند بستیاں عبور کرنے کے بعد ایک ٹیلے پر گھوڑے روک کر اپنے سامنے ایک سرسبز و شاداب وادی دیکھ رہے تھے۔ اکبرخاں نے ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ میرا گاؤں ہے!"

پھر وہ ٹیلے سے اتر کر کچھ دیر ایک گھنے جنگل سے گزرنے کے بعد گندم کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں داخل ہوئے اور اکبرخاں نے کہا: "یہ ہماری زمین ہے!"

تھوڑی دیر بعد وہ گاؤں میں داخل ہوئے اور آن کی آن میں گاؤں کی خاموش گلیاں "اکبرخاں آگیا۔ اکبرخاں آگیا!" کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ بچے، بوڑھے اور جوان ان کے گرد جمع ہوگئے۔ وہ گھوڑوں سے اتر پڑے۔ گاؤں کا ہر شخص اکبرخاں کو دیکھنے، اس سے بغلگیر ہونے اور اس سے باتیں کرنے کے لیے بیقرار تھا۔

تھوڑی دیر بعد یہ ہجوم ایک قلعہ نما مکان کے سامنے رکا اور اکبرخاں نے معظم علی سے کہا۔ "بھائی جان! یہ ہمارا گھر ہے۔"

ایک خوش وضع نوجوان دروازے سے نمودار ہوا اور لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ کر اکبرخاں سے لپٹ گیا۔ یہ اکبرخاں کا بڑا بھائی اطہرخاں تھا۔

چند دن بعد معظم علی اس علاقے کے کسی آدمی کے لیے اجنبی نہ تھا۔ اکبرخاں کے قبیلے کا ہر بچہ بوڑھا اسے اپنا محسن خیال کرتا تھا۔ اطہرخاں جو اپنے باپ کی موت کے بعد قبیلے کا سردار تھا، معظم علی کا بے تکلف دوست بن گیا تھا۔

یہ گاؤں اور اس کے اردگرد دس اور بستیاں، بنگش افغانوں کے لوگوں سے آباد تھیں اور وہ سب اکبرخاں کے خاندان کی سرداری تسلیم کرتے تھے۔ روہیلکھنڈ کے دوسرے افغانوں کی طرح یہ لوگ اچھے کاشت کار اور چرواہے ہونے کے علاوہ بہترین سپاہیانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ بیرونی حملہ آوروں، بالخصوص مرہٹوں کی لوٹ مار سے بچنے کے لیے ہر روہیلہ نوجوان نشانہ بازی، تیغ زنی اور شہسواری میں کمال حاصل کرنا اپنا فرض خیال کرتا تھا۔ جب ہندوستان کے باقی علاقوں کو بے حیا سیاسی شاطروں اور حریص قسمت آزماؤں نے نکبت و افلاس کے

جہنم میں جھونک دیا تھا۔ یہ لوگ اپنی محنت دمشقت سے فراغت اور خوشحالی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنے میں مصروف تھے اور جب بڑے بڑے صوبوں کے عیش پرست حکمرانوں کی افواج اپنی رعایا کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے بچانے سے قاصر تھیں، یہ لوگ اپنی آزادی کی حفاظت کرنے کے لیے متحد اور منظم ہو رہے تھے۔

معظم علی زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ ٹھہرنے کی نیت سے آیا تھا، لیکن اس نے تین مہینے یہاں گذار دیئے۔ ابتدا میں کبھی کبھی وہ اطہر خاں اور اکبر کے ساتھ شیر کا شکار کھیلنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ جب شکار سے اس کا جی بھر گیا تو گاؤں کے لوگوں کے ساتھ تیراندازی، نیزہ بازی اور تیغ زنی کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔

تین ماہ بعد جب وہ اطہر خاں اور اکبر خاں کو خدا حافظ کہہ رہا تھا تو اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے عزیز ترین دوستوں اور ساتھیوں سے جدا ہو رہا ہے۔ اطہر، اکبر اور علاقے کے چند اور آدمی اودھ کی سرحد تک اسے چھوڑنے کے لیے آئے۔ اکبر خاں کے ساتھ جب وہ مصافحہ کر رہا تھا تو اس نے آبدیدہ ہو کر کہا "بھائی جان، آپ پھر کب آئیں گے؟"

"مجھے معلوم نہیں، اکبر خاں! ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے تمھارے پاس آجاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آج کے بعد ہم اس زندگی میں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔"

اکبر خاں سے رخصت ہو کر معظم علی نے آگرہ اور دلی کا رُخ کیا۔ دلی سے واپسی پر کچھ عرصہ لکھنؤ ٹھہرا اور بالآخر اپنے ساتھ مسلمانوں کی زبوں حالی کی دلخراش داستانیں لیے گھر پہنچا۔

◆

گھر میں معظم علی کو سکون نصیب نہ ہوا کچھ عرصہ وہ بیکاری کے لمحات کتابیں پڑھنے میں صرف کرتا رہا، لیکن چند ہفتوں کے بعد اس کی طبیعت کتابوں سے بھی اچاٹ ہو گئی۔ ایک دن اس کا بھائی یوسف علی رخصت پر گھر آیا اور ایک ہفتہ رہ کر واپس چلا گیا۔ جب معظم علی

کے رخصت کے دن ختم ہونے کے قریب آ رہے تھے تو اس نے چند بار استعفا لکھنے کا ارادہ کیا لیکن جب وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھتا تو اس کی قوتِ فیصلہ جواب دے جاتی۔

ایک دن اسے معلوم ہوا کہ سراج الدولہ مرشدآباد آیا ہوا ہے۔ وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سراج الدولہ نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا "کہیے اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا "میں چند دنوں سے ہگلی پہنچنے کا ارادہ کر رہا تھا۔"

سراج الدولہ نے کہا "میری یہ خواہش ہے کہ ہگلی کے قلعے کی کمان آپ کے سپرد کر دی جائے میں ایک ہفتہ تک واپس جا رہا ہوں۔ اس لیے آپ تیار رہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا "اگر ہگلی کے قلعے کے لیے آپ میری ضرورت محسوس کرتے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ میں ایک ہفتہ انتظار کرنے کی بجائے کل ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔"

"بہت اچھا! شام تک آپ کے پاس میرا حکم نامہ پہنچ جائے گا۔"

اگلے دن علی الصباح معظم علی ہگلی کا رخ کر رہا تھا اور چند دن بعد ہگلی کے قلعے کے آرام طلب سپاہی اور افسر ایک دوسرے سے شکایت کر رہے تھے کہ نیا کمانڈر ہمیں ایک لمحے کیلیے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

معظم علی ایک سال بعد چند دن کی رخصت لے کر گھر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اگلے مہینے فرحت کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کے والدین اور مرزا حسین بیگ کی یہ خواہش تھی کہ وہ شادی کی تاریخ تک واپس نہ جائے۔ چنانچہ اس نے سراج الدولہ کو لکھا کہ مجھے تین ہفتے اور مرشدآباد ٹھہرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس خط کا جواب آنے سے پہلے اڑیسہ میں ایک نئے انقلاب کی خبر آگئی اور وہ یہ تھی کہ مرہٹوں نے اچانک حملہ کر کے میر حبیب کو، جسے علی وردی خاں نے مرہٹوں سے مصالحت کی خاطر کٹک کا فوجدار تسلیم کیا تھا، قتل کر دیا ہے اور ان کی افواج اڑیسہ کے بیشتر اضلاع پر قابض ہو چکی ہیں۔

معظم علی کو اپنے باپ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ علی وردی خاں نے مرشدآباد کی فوج کو کوچ کی تیاری کا حکم دیا ہے اور ڈھاکہ اور ہگلی کے فوجداروں کو یہ فرمان بھیجا ہے کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر اپنی

افواج لے کر اڑیسہ کے محاذ پر پہنچ جائیں۔ معظم علی نے کسی توقف کے بغیر ہگلی کا رخ کیا۔

دو ہفتوں کے بعد ہگلی اور مرشد آباد کی فوج کٹک سے چند منزل دور پڑاؤ ڈال کر ڈھاکہ سے میر مدن کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔ محمود علی اور افضل بیگ مرشد آباد کی فوج کے ساتھ آئے تھے۔ پانچ دن بعد میر مدن بھی پانچ ہزار سواروں کے ساتھ پہنچ گیا۔ جب میر مدن کی فوج پڑاؤ میں داخل ہوئی تو فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے میر مدن نے گھوڑے سے اتر کر یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا۔ جب معظم علی کی باری آئی تو اس نے کہا۔ "معظم علی! تمھیں دیکھ کر میری ساری تھکاوٹ دور ہوگئی ہے۔ میں سراج الدولہ سے ملنے کے بعد تمھارے ساتھ اطمینان سے باتیں کروں گا۔"

میر مدن ایک افسر کی رہنمائی میں سراج الدولہ کے خیمے کی طرف بڑھا اور افضل نے جو چند قدم دور کھڑا تھا معظم علی کو آواز دی۔ "معظم علی! تمھارے بھائی جان بھی آگئے ہیں۔"

کہاں ہیں وہ؟" معظم علی نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔

"وہ دیکھو۔" افضل نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یوسف علی کوئی تیس قدم دور لشکر کے چند آدمیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ معظم علی اور افضل تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔ یوسف علی نے ان کے ساتھ یکے بعد دیگرے مصافحہ کیا۔ اچانک افضل کو معظم علی کے پیچھے ایک اور نوجوان دکھائی دیا جو اپنے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔

افضل نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ یہاں کیسے آئے؟"

"میں ڈھاکہ کی فوج کے ساتھ آیا ہوں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

افضل نے کہا۔ "مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ فوج میں شامل ہو چکے ہیں۔"

نوجوان نے قدرے آزردہ ہو کر جواب دیا۔ "اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں

اپنے ساتھ دو سو رضاکار بھی لایا ہوں۔"

معظم علی نے دبی زبان میں یوسف سے پوچھا۔ "بھائی جان یہ کون ہیں؟"

"یہ شوکت بیگ ہیں۔ جن کی افضل کی ہمشیرہ کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔"

افضل نے شوکت بیگ کو معظم علی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ معظم علی ہیں، یوسف علی کے چھوٹے بھائی۔"

شوکت بیگ نے آگے بڑھ کر معظم علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام شوکت بیگ ہے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں آپ کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔"

شوکت بیگ کھلتے ہوئے رنگ کا ایک قوی الجثہ نوجوان تھا اور چہرے سے اس کی عمر کوئی پچیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی، محمود علی، یوسف، افضل اور مرزا شوکت بیگ ایک خیمے میں بیٹھے بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ اب تک معظم علی کو صرف اتنا معلوم تھا کہ شوکت بیگ ڈھاکہ کے ایک بہت بڑے زمیندار کا لڑکا ہے اور میر مدن کی فوج کے ساتھ اس کی آمد اس کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔ لیکن یوسف علی سے استفسار پر اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنی ذاتی فوج کے دو سو سپاہیوں کے ساتھ ایک رضاکار کی حیثیت میں میر مدن کے ساتھ آیا ہے۔ معظم علی کے نزدیک اس کا یہ جذبہ قابل قدر تھا اور اس نے شوکت بیگ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مرزا صاحب! آپ بنگال کے اُمرا کے لیے ایک بہت اچھی مثال پیش کر رہے ہیں۔ ورنہ اب تو حالت یہ ہے کہ بڑے بڑے لوگوں میں اجتماعی خطرات کا احساس تک باقی نہیں رہا۔"

شوکت بیگ نے جواب دیا۔ "اجتماعی خطرے کا مجھے بھی کچھ زیادہ احساس نہیں تھا میں نے صرف آپ کی تقلید کی ہے۔ جب مرشد آباد پر حملہ ہوا تھا اور میں نے یہ سنا تھا کہ آپ نے اپنے محلے کے چند رضاکاروں کے ساتھ مرہٹوں کی ایک منظم فوج کے دانت کھٹے کر دیئے

تھے، تو میرے دل میں بھی اپنے مزارعین کو فوجی تربیت دینے کا خیال پیدا ہوا۔ پھر ایک دفعہ جب مرزا حسین بیگ ہمارے یہاں تشریف لائے اور انھوں نے آپ کے شاندار کارنامے کی بے حد تعریف کرنے کے بعد مجھے بھی تبلیغ کی تو میرا خیال پختہ ہوگیا۔ ہمارا گھر ڈھاکے سے پندرہ میل دور ہے۔ مرزا صاحب اپنے خطوط میں بار بار یہ تاکید کیا کرتے تھے کہ ہمارے مکان کے گرد ایک مضبوط فصیل اور ایک گہری خندق کا ہونا ضروری ہے اور میں نے اپنی سمجھ کے مطابق مرزا صاحب کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو چند دن کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرے خاندان کے لوگ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

رات کے وقت جب معظم علی کو تنہائی میں اپنے بھائی یوسف کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ملا تو اس نے پوچھا "بھائی جان! مجھے تو مرشد آباد میں یہ معلوم ہوا تھا کہ اگلے مہینے فرحت کی شادی ہونے والی ہے؟"

یوسف نے جواب دیا "فرحت کی شادی اس مہم کے اختتام تک کے لیے ملتوی کردی گئی ہے۔ مرزا حسین بیگ نے اڑلیسہ کے حالات کی اطلاع ملتے ہی شوکت بیگ کے والد کو لکھا تھا کہ افضل فوج کے ساتھ اڑلیسہ کی مہم پر جا رہا ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ جب تک ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے فرحت کی شادی ملتوی کردی جائے۔ شوکت بیگ غالباً مرزا صاحب کو خوش کرنے کے لیے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینا چاہتا ہے۔" یہ یہ میر مدن کے ساتھ آگیا ہے۔"

معظم علی نے سوال کیا "آپ اس سے کب متعارف ہوئے؟"

"اس نے خود ہی ڈھاکہ میں تلاش کیا تھا۔ ایک دن یہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے مرزا حسین بیگ نے لکھا ہے کہ میں آپ سے ملوں۔ شوکت بیگ اچھا آدمی ہے۔ ایک دن یہ مجھے اپنے گھر بھی لے گیا تھا۔ ان کا خاندان بہت با اثر ہے اور میر مدن کے ساتھ اس کے والد کے نہایت دوستانہ تعلقات ہیں۔"

* * *

چند ہفتے بنگال اور مرہٹہ افواج کے درمیان معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں، پھر مرہٹہ سپہ سالار جانوجی نے ایک شدید حملہ کے بعد بنگال کی فوج کو میدنا پور کی طرف ہٹنے پر مجبور کردیا۔ بنگال کی فوج اب میدنا پور کو اپنا مستقر بنا کر اڑلیسہ کی شمالی سرحد کے آس پاس مرہٹوں کے اکا دکا حملے روکنے پر اکتفا کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے تیاریاں بھی کر رہی تھی۔ پھر اچانک ایک دن یہ اطلاع آئی کہ مرہٹوں کے ساتھ بعض افغان سرداروں کے ساز باز کے باعث بہار کے لیے خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ اس لیے علی وردی خاں نے مرہٹہ سپہ سالار جانوجی کے ساتھ جنگ جاری رکھنے کا ارادہ ترک کرکے لشکر کو واپس بلا لیا۔

فوج کا کوئی سپاہی یا افسر اڑلیسہ کا صوبہ اس طرح جانوجی کے حوالے کردینے پر خوش نہ تھا۔ لیکن شوکت بیگ کے لیے یہ خبر انتہائی ناقابل برداشت تھی۔ میر مدن نے اسے شروع سے چند جنگی قیدیوں کی نگرانی سونپ رکھی تھی اور اسے انتہائی کوشش کے باوجود کسی معمولی لڑائی میں بھی اپنے سپاہیانہ جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ لشکر کی واپسی کی خبر سنتے ہی انتہائی غم و غصہ کی حالت میں میر مدن کے خیمے میں داخل ہوا اور اس پر برس پڑا: "میر صاحب میں یہاں مکھیاں مارنے نہیں آیا تھا۔ میرے آدمی گھر جاکر میرا مذاق اڑائیں گے۔"

میر مدن مسکرایا: "میرے خیال میں تمھیں ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ کوئی سالار اشد ضرورت کے بغیر ناتجربہ کار رضاکار کو کسی مہم پر نہیں بھیج سکتا اور تمھیں معلوم ہے کہ مرہٹوں کے ساتھ اکا دکا جھڑپوں میں ہم نے صرف نہایت آزمودہ کار دستے بھیجے تھے۔ اگر باقاعدہ جنگ شروع ہو جاتی تو تمھیں یقیناً اپنے جوہر دکھانے کا موقع دیا جاتا۔"

معظم علی خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: "آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"ہاں۔ مجھے تازہ اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب بہار کے مخدوش

حالات کے پیش نظر اڑلیسہ کے متعلق جانوجی کے ساتھ تصفیہ کر چکے ہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ مرہٹے کسی معاہدے پر قائم نہیں رہیں گے۔ بہار کے جنوب مغربی علاقوں کو ان کی دست درازی سے محفوظ رکھنے کے لیے سراج الدولہ کی نگاہِ انتخاب تم پر پڑی ہے۔ اب اڑلیسہ کی بجائے بہار کی جنوب مغربی سرحد کا آخری قلعہ تمھارا مستقر ہوگا۔ وہاں اس وقت تک اطراف کی کئی بستیاں مرہٹہ لٹیروں کے ہاتھوں تباہ ہو چکی ہیں۔"

شوکت بیگ نے کہا۔ "میر صاحب! میں اس مہم میں معظم علی کا ساتھ دوں گا!"

میر مدن نے جواب دیا۔ "نہیں، میں ایک رضاکار کو ایسی خطرناک مہم پر نہیں بھیج سکتا۔"

شوکت بیگ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں آپ کے سامنے حلف اٹھاتا ہوں کہ جب تک معظم علی اس مہم سے فارغ ہو کر گھر نہیں جاتا میں اس کے ساتھ رہوں گا۔"

معظم علی نے کہا۔ "میں آپ کی ضد کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ اگر جانوجی کے ساتھ کوئی مصالحت ہو چکی ہے تو اس علاقے میں کسی باقاعدہ جنگ کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ جنگل میں بکھرے ہوئے لیٹروں اور رہزنوں سے نپٹنے کے لیے ہمیں انتہائی تجربہ کار سپاہیوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں آپ کی بہادری کا اعتراف کرتا ہوں۔ لیکن اس مقصد کے لیے ہمیں ناتجربہ کار رضاکاروں کی ضرورت نہیں۔ آپ کو اب گھر جانا چاہیئے اور مجھے یقین ہے کہ آپ جنگلوں میں ہمارے ساتھ وقت ضائع کرنے کی بجائے وہاں بنگال کے لیے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔"

شوکت بیگ نے قدرے برہم ہو کر کہا۔ "میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ میری جان کو اس قدر قیمتی سمجھتے ہیں۔ لیکن میں دشمن کے ساتھ لڑنے کی نیت سے آیا ہوں!" پھر وہ میر مدن کی طرف متوجہ ہوا۔ "میرا خیال ہے کہ ایک رضاکار کی حیثیت میں مرہٹوں سے لڑنے کے لیے مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ معظم علی مجھے اپنا ساتھی بنانے سے انکار کر سکتے ہیں، لیکن مجھے ی جنگل میں مرہٹوں کا پیچھا کرنے سے نہیں روک سکتے۔ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ آخر آپ

میری جان ان سپاہیوں سے زیادہ قیمتی کیوں سمجھتے ہیں جو جنگ میں شہید ہو چکے ہیں؟"

میر مدن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "اگر تمھارا یہی فیصلہ ہے تو میں منع نہیں کرتا۔ معظم علی اسے اپنے ساتھ لے جاؤ!"

معظم علی نے جواب دیا۔ "بہت اچھا۔ لیکن میں نے فوجی تربیت آپ سے حاصل کی ہے اور میرے افسر اور سپاہی اکثر شاکی رہتے ہیں کہ میں نظم و ضبط کے معاملے میں بہت سخت ہوں۔ اس لیے جب تک یہ میری کمان میں ہیں انھیں یہ امید نہیں رکھنی چاہیئے کہ انھیں کسی ترجیحی سلوک کا مستحق سمجھا جائے گا۔"

میر مدن نے شوکت بیگ کی طرف دیکھا اور وہ بولا۔ "جناب میں جانتا ہوں کہ میں سیر و سیاحت کے لیے نہیں آیا۔"

تھوڑی دیر بعد جب محمود علی، یوسف اور افضل کو شوکت بیگ کے ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے ارادے پر قائم رہا۔

اگلے روز علی الصباح دو ہزار سوار معظم علی کی قیادت میں کوچ کے لیے تیار کھڑے تھے اور محمود علی اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا۔ "معظم! شوکت بیگ کا خیال رکھنا۔ اگر خدانخواستہ اسے کوئی حادثہ پیش آگیا تو ہم مرزا حسین بیگ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

* * *

چند ماہ بعد معظم علی پھر ایک دور افتادہ قلعے میں مقیم تھا۔ اس عرصہ میں دشمن کے ساتھ اس کی کئی جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ لیکن دور دور تک پھیلے ہوئے جنگلوں اور پہاڑوں میں مرہٹے ایک جگہ سے مار کھا کر بھاگتے تو دوسری جگہ کسی دوسری بستی پر حملہ کر دیتے۔ معظم علی اپنی فوج کے باقاعدہ سپاہیوں اور افسروں سے کام لینا جانتا تھا، لیکن شوکت بیگ اور اس کے رضاکار ساتھیوں کی رفاقت اس کے لیے ایک مسئلہ تھی۔ وہ انھیں قلعے کی محافظ فوج کے ساتھ رکھنا چاہتا تھا لیکن شوکت بیگ ہر خطرناک مہم میں اس کا ساتھ دینے پر اصرار کیا کرتا تھا۔

ایک روز آدھی رات کے وقت معظم علی کو قلعے سے بیس میل دور دشمن کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی اور اس نے اسی وقت پانچ سو سواروں کو تیاری کا حکم دیا۔ شوکت بیگ نے حسب معمول ساتھ جانے پر اصرار کیا اور اس دفعہ وہ انکار نہ کر سکا۔ اس مہم میں معظم علی کو یہ احساس ہوا کہ یہ سادہ دل نوجوان حماقت کی حد تک بہادر ہے۔ اس لڑائی میں شوکت بیگ یہ ثابت کر چکا تھا کہ گولیوں کی بارش میں بھی وہ سینہ تان کر کھڑا ہو سکتا ہے اور پھر جب دشمن کے سپاہی شکست کھا کر جنگل میں بھاگ رہے تھے تو وہ معظم علی کے احکام کا انتظار کیے بغیر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ جن سپاہیوں نے اسے جنگلوں اور پہاڑیوں میں گھوڑا دوڑاتے دیکھا تھا وہ شام کے وقت معظم علی سے یہ کہہ رہے تھے: "یہ محض اتفاق ہے کہ یہ نوجوان زندہ واپس آگیا ہے۔"

جب شوکت بیگ کئی میل مرہٹوں کا تعاقب کرنے کے بعد واپس آیا تو اس نے معظم علی سے کہا: "میں نے سات آدمی اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتارے ہیں لیکن افسوس کہ میرا گھوڑا تھک گیا تھا۔"

معظم علی نے کہا: "دیکھو شوکت! مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ تم بہادر ہو لیکن تم بلاوجہ اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہو۔ آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو مجھے مجبوراً تمھیں قلعے میں بند رکھنا پڑے گا۔ تمھارے آٹھ آدمی بلاوجہ مارے گئے ہیں۔"

شوکت نے جواب دیا: "لیکن ان آٹھ آدمیوں میں سے ہر ایک کم از کم دو مرہٹوں کو ساتھ لے کر مرا ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "اگر وہ آٹھ آدمی زندہ رہتے تو یقیناً اس سے بہتر نتائج پیدا کر سکتے تھے۔"

شوکت بیگ نے کہا: "یہ میری پہلی لڑائی تھی۔ لیکن آئندہ کے لیے میں محتاط رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا: "اس لڑائی میں تمھاری کارگزاری دیکھنے کے بعد اگر مجھے یہ یقین نہ ہوا ہوتا کہ تم ایک اچھے سپاہی بن سکتے ہو تو میں آج ہی تمھیں واپس بھیج دیتا۔"

اس واقعے سے چند ماہ بعد معظم علی کو قلعے کے جنوب میں تیس میل دور مرہٹوں کے ایک لشکر کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی اور اس نے اپنی دو تہائی فوج قلعے میں چھوڑ کر باقی سپاہیوں کے ساتھ پیش قدمی کی۔ آٹھ دن بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو سو قیدی تھے۔ فوج کا ایک افسر اسے قلعے کے دروازے پر ملا اور اس نے مغموم لہجے میں کہا: "جناب مرزا شوکت بیگ زخمی ہیں اور ان کی حالت بہت خراب ہے۔"

معظم علی نے گھوڑے سے اترتے ہی اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی: "کہاں ہیں وہ — وہ زخمی کیسے ہوئے — ؟ جواب کیوں نہیں دیتے — ؟ میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

افسر نے جواب دیا: "وہ اپنے کمرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ہمارا کہا نہیں مانا۔ کل ہمیں شمال کی طرف چند بستیوں میں مرہٹوں کے لوٹ مار کی اطلاع ملی تھی۔ نائب کماندار نے اسی وقت دو سو سوار روانہ کر دیے۔ مرزا شوکت بیگ اس مہم میں حصہ لینے پر مصر تھے۔ ہم نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔"

"تم سب بیوقوف ہو۔"

معظم علی یہ کہہ کر بھاگتا ہوا قلعے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ شوکت بیگ بستر پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ اس کے سینے، گردن اور بازوؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ فوجی طبیب کے علاوہ چند افسر اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور چند سپاہی کھڑے تھے۔ معظم علی نے کمرے میں داخل ہو کر شوکت بیگ کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر طبیب کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا: "زخم زیادہ شدید تو نہیں؟"

طبیب نے جواب دیا: "بہت شدید ہیں۔"

معظم علی نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنے سالاروں کی طرف دیکھا اور کہا: "یہ

نے حکم دیا تھا کہ ہر قیمت پر ان کی حفاظت کی جائے اور اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ یہ تم میں سے کس کی غفلت کا نتیجہ ہے؟"

ایک سالار نے جواب دیا۔ "ہم سب نے انھیں روکنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ پھر میں احتیاطاً ڈیڑھ سو سپاہی لے کر ان کے پیچھے گیا تھا۔ مرہٹے ہمیں دیکھتے ہی بھاگ نکلے۔ ہم نے کوئی پانچ میل ان کا تعاقب کیا اس کے بعد جنگل زیادہ گنجان تھا اور میں نے سپاہیوں کو واپسی کا حکم دیا۔ لیکن یہ مرہٹوں کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ میں مجبوراً ان کے پیچھے پیچھے چلتا گیا اور چیخ چیخ کر انھیں روکنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے میری طرف توجہ نہ دی۔ اچانک گھنے جنگل میں ایک ٹیلے کے پیچھے سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور آن کی آن میں ہمارے پچیس آدمی گر پڑے، اس کے بعد مرہٹے مقابلہ کرنے کی بجائے جنگل میں غائب ہو گئے۔ یہ بری طرح زخمی تھے۔ آپ ان کے آدمیوں سے پوچھ سکتے ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ کاش آپ کی طرف سے ہمیں یہ اجازت ہوتی کہ اگر یہ زبردستی قلعے سے باہر نکلنے کی کوشش کریں تو انھیں کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے!"

معظم علی نڈھال سا ہو کر شوکت بیگ کے بستر کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "تم نے بہت برا کیا۔ اب میں مرشد آباد واپس جا کر منہ دکھلانے کے قابل نہیں رہا۔"

شوکت بیگ نے آنکھیں کھولیں اور کراہتے ہوئے کہا۔ "آپ کے ساتھی بے قصور ہیں۔ انھوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اپنی ذمہ داری پر دشمن کا پیچھا کیا تھا۔"

معظم علی نے پرامید ہو کر طبیب کی طرف دیکھا اور ملتجی لہجے میں کہا۔ "آپ ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں!"

طبیب نے جواب دیا۔ "آپ اطمینان رکھیے میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔"

شوکت بیگ نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

شام تک شوکت بیگ پر بیہوشی کے دورے پڑتے رہے۔ عشاء کی نماز کے بعد معظم علی انتہائی اضطراب اور پریشانی کی حالت میں قلعے کے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ وہ تصور میں کبھی مرزا حسین بیگ اور کبھی فرحت اور اس کی والدہ کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔ "تم نے شوکت کو تنہا کیوں چھوڑ دیا؟ تم نے اس کی حفاظت کیوں نہ کی؟ جب ڈھاکہ کی فوج واپس آ رہی تھی تو تم اسے اپنے ساتھ کیوں لے گئے؟" وہ ندامت کے ناقابلِ برداشت بوجھ تلے پسا جا رہا تھا اور اس کی زبان سے بار بار اس قسم کی دعائیں نکل رہی تھیں۔ "میرے مولیٰ! اگر تیری بارگاہ میں میری کوئی دعا قبول ہو سکتی ہے تو میں تجھ سے شوکت کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔ میرے اللہ میں عہد کرتا ہوں کہ میں مرتے دم تک فرحت کا خیال اپنے دل میں نہیں لاؤں گا۔ تو جانتا ہے کہ میں خلوص دل سے یہ چاہتا ہوں کہ وہ زندہ رہے، اس میں تمام وہ خوبیاں ہیں جو فرحت کے رفیقِ حیات میں ہونی چاہئیں، وہ فرحت کو خوش رکھ سکتا ہے اور فرحت کی خوشی میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔"

طبیب شوکت کے کمرے سے باہر نکلا اور اس نے معظم علی کے قریب پہنچ کر کہا۔ "وہ اب ہوش میں ہے اور آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور شوکت بیگ کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چراغ کی روشنی میں اسے شوکت بیگ کا چہرہ بے حد زرد نظر آتا تھا۔ اس نے مغموم لہجے میں کہا۔ "شوکت اب کیا حال ہے؟"

شوکت نے ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میرے دوست آپ کو میرے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کی حکم عدولی کی۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔"

"شوکت بیگ! مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تمہارا زندہ رہنا ضروری ہے۔"

شوکت نے کہا: "آپ مجھے ہمیشہ خطرے کے سامنے جانے سے روکنے کی کوشش کیا کرتے تھے، مجھے اس بات سے چڑ ہوگئی تھی۔ میں بچپن سے بے حد ضدی ہوں۔ میں ہمیشہ یہ محسوس کیا کرتا تھا کہ آپ شاید مجھے بزدل سمجھتے ہیں۔"

"نہیں شوکت! مجھے صرف اس بات کا ڈر تھا کہ تمھاری جرأت میرے لیے کسی پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔"

شوکت نے کہا۔ "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ باقی آدمیوں کے مقابلے میں میری جان اس قدر قیمتی کیوں سمجھتے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا: "اگر تم باقاعدہ فوج کے سپاہی ہوتے تو تمھیں یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن تم ایک رضاکار کی حیثیت میں آئے تھے اور میں چاہتا تھا کہ صحیح سلامت اپنے گھر واپس جاؤ۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ تمھاری شادی ہونے والی ہے اور ایک ایسے خاندان کی لڑکی سے جو مجھے بے حد عزیز ہے۔ اب میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ تم تندرست ہو کر اپنے گھر پہنچ جاؤ اور خدا مجھے مرزا حسین بیگ کے سامنے شرمسار نہ کرے۔"

شوکت بیگ نے کہا: "میں شاید گھر واپس نہ جا سکوں۔ لیکن آپ جب مرزا حسین بیگ سے ملیں تو ان سے یہ ضرور کہیں کہ میری موت ایک سپاہی کی موت تھی۔ میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے سپاہی بننے کا شوق کبھی نہ تھا اور یہ شوق صرف تمھاری وجہ سے پیدا ہوا۔ میں بچپن میں ہی اپنے والدین سے سنا کرتا تھا کہ میری منگنی مرشد آباد کے ایک معزز خاندان کی لڑکی کے ساتھ ہوگی۔ اس کے بعد بڑا ہو کر میں نے یہ سنا کہ ایک غریب خاندان کے لڑکے نے اپنی جان پر کھیل کر مرزا حسین بیگ کے گھر کی حفاظت کی ہے اور شاید وہ اس کے ساتھ اپنی لڑکی کا رشتہ کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ پھر تمھاری قید کے زمانے میں مرزا صاحب ہمارے ہاں آئے تو وہ بات بات پر تمھارا تذکرہ کرتے تھے اور مجھے بار بار یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ اس زمانے میں ہر نوجوان کے لیے سپاہی بننا ضروری ہے اور میں تمھیں دیکھے بغیر ہی تمھارے متعلق اپنے دل میں ایک رقابت کا جذبہ محسوس کرتا تھا۔

ایک دن میرے ابا جان نے مرزا حسین بیگ کے سامنے میری تعریف کی تو انھوں نے کہا۔ بنگال میں صرف ایک نوجوان پیدا ہوا تھا اور اس کا نام معظم علی تھا۔ پھر ہماری منگنی ہوگئی اور اس کے چند ہی ہفتے بعد تم واپس آگئے۔

میری شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ لیکن جب ڈھاکہ کی فوج اڑیسہ کی طرف کوچ کی تیاری کر رہی تھی تو میرے ابا جان کو حسین بیگ کا خط ملا جس میں انھوں نے یہ لکھا تھا کہ افضل محاذ پر جا رہا ہے۔ مرہٹے ہماری قوم کے ہر نوجوان کو اڑیسہ کے میدانوں میں للکار رہے ہیں اس لیے میری خواہش ہے کہ جنگ کے اختتام اور افضل بیگ کی واپسی تک شادی ملتوی کر دی جائے۔ انھوں نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ میرے جن دوستوں کا شادی کے موقع پر ہونا ضروری ہے وہ سب محاذ پر جا چکے ہیں۔ میں اسی وقت سیدھا میر مدن کے پاس پہنچا اور انھیں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اب تم سمجھ گئے ہو کہ میرے یہاں آنے کی وجہ کیا تھی۔ میں مرزا حسین بیگ پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں بنگال کے کسی نوجوان سے کم نہیں ہوں۔ میری یہ خواہش تھی کہ مرزا حسین بیگ کے گھر میں کسی اور کی بجائے صرف میرے بہادرانہ کارناموں کا ذکر ہو۔ میں ہر میدان میں تم سے چند قدم آگے رہنا چاہتا تھا۔ لیکن میں کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہ دے سکا۔ میں کوشش کے باوجود ان لوگوں کی صف میں کھڑا نہ ہو سکا جنھیں لڑائی کے بعد داد و تحسین کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ تم ہر میدان میں مجھ سے آگے تھے اور میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میری حیثیت ایک تماشائی سے زیادہ نہیں۔ اس وقت اگر مجھے کسی بات کا افسوس ہے تو وہ یہ ہے کہ میں اپنے ایک بہترین دوست اور ساتھی کو اپنا رقیب سمجھتا تھا۔ مرزا حسین بیگ درست کہتے تھے کہ بنگال نے صرف ایک نوجوان پیدا کیا اور وہ معظم علی ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "بنگال کے ہزاروں نوجوان مجھ سے بہتر ہیں اور تم ان میں سے ایک ہو۔"

شوکت بیگ نے کہا: "معظم علی مجھے یقین ہے کہ اگر میں زندہ رہا تو ہم ایک دوسرے کے لیے بہترین دوست ثابت ہوں گے لیکن میری منزل اب قریب آ چکی ہے۔ اس وقت

اگر مرزا حسین بیگ یہاں موجود ہوتے تو میں ان سے یہ کہتا کہ میں نے معظم علی بننے کی کوشش کی تھی اور یہ میری حماقت تھی۔

انسان اپنی زندگی میں عجیب و غریب باتیں کرتا ہے۔ ایک دن وہ تھا جب تمہارا نام میرے نزدیک ایک گالی تھا۔ معظم علی بُرا نہ ماننا۔ اب مجھے یہ باتیں کہتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ مجھے اس بات سے چڑ تھی کہ تم مرزا حسین بیگ کے پڑوس میں رہتے ہو اور محلے کا ہر آدمی تمہاری تعریفیں کرتا ہے۔ میں نے آج تک فرحت کو نہیں دیکھا لیکن جو کچھ اس کے متعلق میں نے اپنی ماں اور بہنوں سے سنا تھا وہ میرے دل میں یہ احساس پیدا کرنے کے لیے کافی تھا کہ ایسی لڑکی کا شریکِ حیات بننا زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ مجھے یہ بات گوارا نہ تھی، کہ وہ کسی ایسے آدمی کو جانتی ہو جو مجھ سے بہتر اوصاف کا مالک ہو۔ فرحت کے رشتے سے مرزا حسین بیگ کا انکار میری زندگی کی سب سے بڑی شکست تھی اور میرے لیے اس شکست کا سب سے زیادہ ناقابل برداشت پہلو یہ تھا کہ میرے مقابلے میں ایک غریب خاندان کے لڑکے کو ترجیح دی گئی ہے۔ اپنے والدین کی باتوں سے مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ فرحت کے والدین تمہاری طرف مائل ہیں۔ پھر جب تم لاپتہ ہو گئے تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ میرے راستے سے ایک پہاڑ ہٹ گیا ہے۔ لیکن فرحت کے ساتھ منگنی ہو جانے کے بعد بھی میری خوشی ادھوری تھی۔ مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ میں اس کے لیے معظم علی نہیں بن سکوں گا۔ پھر ہماری شادی کی تاریخ ملتوی کرنے کے متعلق مرزا صاحب نے جو خط لکھا اسے پڑھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ مجھے بے حسی، بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دیا جا رہا ہے جب میں گھر سے روانہ ہوا تھا تو میرے عزائم یہ تھے کہ میں کسی دن فتوحات کے پرچم لہراتا ہوا واپس آؤں گا۔ اور شہرت، عزت اور ناموری کے سینکڑوں تاج فرحت کے قدموں پر ڈھیر کر دوں گا۔ تم میری حماقتوں پر ہنسو گے۔"

معظم علی نے کہا۔ "نہیں شوکت! میں جانتا کہ تمہارے سینے میں ایک نہایت حسین

دل ہے۔ لیکن کاش اس سے پہلے میں تمھیں یہ بتا سکتا کہ میں جس فرحت کو جانتا ہوں، وہ ان لڑکیوں سے مختلف ہے جو اپنے رفیقِ حیات کا دوسرے انسانوں سے موازنہ کرتی ہیں۔"

شوکت بیگ نے کہا تم اسے جانتے ہو اور تم اس سے محبت کرتے ہو؟"

معظم علی کا سارا جسم کپکپا اٹھا اور اس نے کہا "شوکت خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ وہ تمھارے لیے ہے اور میں اس کے متعلق سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں تمھیں تندرست ہوتے ہی گھر بھیج دوں گا۔"

شوکت بیگ نے کہا۔ "میرے دوست ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب گھر واپس نہیں جاؤں گا۔ میں نے یہ باتیں تمھارا دل دُکھانے کے لیے نہیں کیں، صرف اس لیے کی ہیں کہ میرے دل پر یہ ایک بوجھ تھا کہ میں ایک ایسے آدمی کے خلاف اپنے دل میں نفرت اور رقابت کے جذبات رکھتا تھا جس کے ساتھ مجھے محبت کرنی چاہیئے تھی۔ معظم علی! تم انسان نہیں ایک فرشتہ ہو۔ کاش اس وقت افضل کی بہن یہاں موجود ہوتی اور اسے میں یہ کہہ سکتا کہ میں تمھارا مستقبل ایک بہتر انسان کو سونپ کر جا رہا ہوں

شوکت بیگ نے یہ کہہ کر معظم علی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ معظم علی کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے اور شوکت بیگ کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھ پر شوکت بیگ کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ معظم علی نے طبیب کو آواز دی طبیب نے آ کر شوکت بیگ کی نبض دیکھی اور اس نے مغموم لہجے میں کہا "ان کا وقت آ چکا ہے۔"

اس کے بعد وہ دیر تک جانکنی کی حالت میں پڑا رہا اور رات کے پچھلے پہر جب قلعے سے باہر کسی درخت پر کوئل کی آواز صبح کی آمد کا پیغام دے رہی تھی۔ شوکت بیگ اپنا سفرِ حیات ختم کر چکا تھا۔

○

طلوع آفتاب کے تھوڑی دیر بعد شوکت بیگ کو سپردِ خاک کیا جاچکا تھا اور اس کے ساتھی واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ معظم علی نے شوکت بیگ کے والد اور مرزا حسین بیگ کے نام خطوط لکھ کر ان کے حوالے کر دیئے۔

اگلے دن معظم علی، علی الصباح ایک ہزار سوار لے کر مرہٹوں کے تعاقب میں روانہ ہوا اور چند مہینے سرحد کے جنگلوں اور پہاڑوں میں ان کا پیچھا کرتا رہا۔ جب وہ اس مہم سے فارغ ہو کر واپس آیا تو اس کے ساتھ چار سو قیدی تھے۔ اس کے بعد قریباً ڈیڑھ سال وہ سرحد کے اہم مقامات پر دفاعی چوکیاں تعمیر کرنے اور مرہٹوں کے ستائے ہوئے لوگوں کی ویران بستیوں کو دوبارہ آباد کرنے میں مصروف رہا۔ پھر اس نے میر مدن کے نام درخواست لکھ کر ایک ماہ کی رخصت لی اور مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا۔

مرشد آباد پہنچتے ہی اسے معلوم ہوا کہ علی وردی خاں بسترِ مرگ پر ہے اور سراج الدولہ نے میر مدن اور سلطنت کے چند اور بڑے عہدیداروں کو مرشد آباد بلا لیا ہے۔ مرزا حسین بیگ کے متعلق اسے یہ اطلاع ملی کہ وہ چند ہفتے قبل ایک جہاز پر حج اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی نیت سے روانہ ہو چکے ہیں۔

معظم علی نے گھر میں اپنی چھٹی کے پانچ دن گزارے تھے کہ علی وردی خاں راہیِ ملکِ عدم ہوا اور مرشد آباد کے باشندے یہ محسوس کر رہے تھے کہ بنگال کا وہ دفاعی حصار ٹوٹ چکا ہے جسے وہ اپنی آزادی اور بقا کی سب سے بڑی ضمانت سمجھتے تھے۔ مرشد آباد کی مساجد میں علی وردی خاں کے لیے مغفرت اور بنگال کے نئے حکمران سراج الدولہ کے لیے کامیابی اور کامرانی کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

علی وردی خاں کی وفات کے تین دن بعد معظم علی نے میر مدن سے، جسے ڈھاکہ سے بلا کر بنگال کی فوج کی سپہ سالاری سپرد کی گئی تھی، ملاقات کی اور اس کے بعد گھر واپس آ کر اپنی

ماں سے کہا: "امی جان! میری رخصت منسوخ کر دی گئی ہے اور میں کل صبح سویرے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

ماں نے مغموم لہجے میں کہا: "میرا خیال تھا کہ سراج الدولہ اور میر مدن تمھیں مرشد آباد میں کوئی عہدہ دے دیں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "امی جان میرا وہاں جانا ضروری ہے۔ میں نے میر مدن سے درخواست کی تھی کہ وہ بھائی یوسف کو ڈھاکہ سے یہاں بلا لیں اور انھوں نے میری یہ بات مان لی ہے۔"

ماں نے کہا: "بیٹا! میں ایک عرصہ سے سوچ رہی تھی کہ مرزا حسین بیگ کے گھر جا کر تمھارے رشتے کے متعلق کچھ کہوں۔ ابھی فرحت کی ماں مجھ سے مل کر گئی ہے اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ حج کے لیے روانہ ہونے سے پہلے مرزا صاحب فرحت کے رشتے کے متعلق ہماری طرف سے سلسلہ جُنبانی کے منتظر تھے۔ میں نے کہا۔ بہن میں تو ہر روز معظم کے ابا کو مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کو کہا کرتی تھی، لیکن انھیں حوصلہ نہیں ہوا۔ اب اگر آپ تیار ہیں تو میں ابھی محلے میں مٹھائی تقسیم کرواتی ہوں۔ لیکن انھوں نے جواب دیا کہ ہمیں حج سے مرزا صاحب کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

معظم علی نے جھجکتے اور شرماتے ہوئے کہا: "امی جان فرحت کیسی ہے؟"

ماں نے جواب دیا: "فرحت چند ہفتوں سے کچھ بیمار تھی۔ لیکن اب بالکل ٹھیک ہے۔"

چند دن بعد معظم علی سرحدی قلعے میں پہنچ چکا تھا۔

○

علی وردی خاں کے آنکھیں بند کرتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا۔ انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں قلعوں اور اسلحہ خانوں میں تبدیل ہونے لگیں اور وہ حریص قسمت آزما جو قوم کی عزت اور آزادی کو مالِ تجارت سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے

ساتھ سازباز کرنے لگے۔ سراج الدولہ کو انگریزوں کے عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی اور اس نے مسندِ حکومت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف توجہ کی۔ انگریز تاجر، حکومتِ بنگال کے ساتھ اپنے سابقہ معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر قلعہ بندیوں میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ مصالحت کی گفتگو بے نتیجہ ثابت ہو چکی تھی اور سراج الدولہ کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ بنگال کی حکومت کے نئے دعویداروں کو صرف ایک فوجی شکست ہی راہ راست پر لا سکتی ہے۔ چنانچہ ایک دن فورٹ ولیم کے سفید فام محافظ شیر بنگال کی گرج سن رہے تھے۔

معظم علی چند ماہ سے مغربی سرحد پر اپنا مورچہ سنبھالے ہوئے تھا۔ اسے انگریزوں کے متعلق سراج الدولہ کے عزائم کا علم ہوا تو اس نے میر مدن کو ایک خط لکھا کہ اب سرحدی علاقوں کو کوئی خطرہ نہیں، اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کا موقع دیا جاتے۔"

چند ہفتوں تک اس کی درخواست کا کوئی جواب نہ آیا اور وہ سخت بے چین رہا۔ پھر ایک دن اسے میدنا پور کے فوجدار کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ نواب سراج الدولہ نے فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کے چار دن بعد اسے میر مدن کا خط ملا۔ جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ہم انگریزوں کو ایک عبرتناک شکست دے چکے ہیں۔ لیکن تمھیں یہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری اس کامیابی میں تمھارا کوئی حصہ نہیں۔ انگریزوں کے خلاف ہم نے ایک لڑائی جیتی ہے لیکن بنگال کو ان کی ہوس ملک گیری سے بچانے کے لیے ہمیں شاید ایسی کئی اور جنگیں لڑنی پڑیں اور ان جنگوں سے ہم اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ ہمارے سرحدی علاقے مرہٹوں کے حملوں سے محفوظ ہوں۔ تمھیں ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے اور تم نے ہر مرحلے پر اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کیا ہے اس لیے میری یہ خواہش ہے کہ جب تک انگریزوں سے ہماری جنگ ختم نہیں ہوتی تم بنگال کے

مغربی دروازے پر پہرہ دیتے رہو اور میں تم جیسے سمجھدار نوجوان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ لڑنے والے سپاہی کی نسبت خاموشی سے پہرہ دینے والے سپاہی کا کام بسا اوقات زیادہ صبر آزما ہوتا ہے۔"

چند مہینے اور گزر گئے اور معظم علی کو اس کے سوا کچھ معلوم نہ تھا کہ سراج الدولہ انگریزوں پر فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ایک دن اسے اپنے والد کا خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ مرزا حسین بیگ حج سے واپس آ گئے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے کہ تم چند دن کے لیے گھر آؤ۔ اس نے میدنا پور کے فوجدار کو ایک ماہ کی رخصت کے لیے درخواست بھیجی، لیکن اس نے جواب میں لکھا کہ "موجودہ حالات میں تمھیں ایک دن کیلئے بھی چھٹی دینا ممکن نہیں۔ نواب سراج الدولہ نے مجھ سے پانچ ہزار سوار دو ہفتوں کے اندر اندر مرشد آباد بھیجنے کا مطالبہ کیا ہے' انھوں نے اس کی وجہ بیان نہیں کی تاہم سپہ سالار کے خط سے میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ عنقریب انگریزوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ مدت اور انتظار کرو۔ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو میں تمھیں ایک ماہ کی بجائے دو ماہ کی چھٹی دے دوں گا۔ فی الحال پانچ ہزار سواروں کی تعداد پوری کرنے کیلئے تمھارے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے میرا خط ملتے ہی اپنے تمام فالتو سپاہی سیدھے مرشد آباد روانہ کر دو اور اپنے پاس صرف اتنے آدمی رکھو جو قلعے اور سرحدی چوکیوں کی حفاظت کے لیے اشد ضروری ہوں۔"

معظم علی نے یہ خط ملتے ہی پانچ سو سپاہی قلعے کی حفاظت اور تین سو آس پاس کی چھوٹی چھوٹی چوکیوں کی نگرانی کے لیے روک لیے اور باقی فوج کو اپنے ایک تجربہ کار افسر کی کمان میں دے کر مرشد آباد کی طرف کوچ کا حکم دیا۔

* * *

چند ہفتے معظم علی کو مرشد آباد کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی اور وہ سخت بے چین رہا۔

ایک دن اسے محمود علی کا خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ: "مجھے سراج الدولہ نے اپنے محافظ دستوں کا سالارِ اعلیٰ مقرر کر دیا ہے۔ یوسف اور افضل بھی محافظ فوج کے سالار بنا دیئے گئے ہیں۔ ہمیں آٹھ پہر کے اندر اندر یہاں سے کوچ کا حکم ملا ہے اور انشاء اللہ عنقریب تم یہ سنو گے کہ ہم بنگال کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا چکے ہیں"

اس کے بعد چند دن اور گزر گئے اور معظم علی کو جنگ کے حالات کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی۔

ایک روز رات کے تیسرے پہر معظم علی قلعے کے اندر اپنی قیام گاہ کی چھت پر گہری نیند سو رہا تھا۔ ایک پہریدار نے اسے جگایا اور یہ اطلاع دی کہ مرہٹوں نے سرحد کی ایک چوکی پر اچانک حملہ کر کے تیس سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیئے ہیں معظم علی جلدی سے نیچے اترا۔ چند سپاہی جو سرحد کی چوکی سے بھاگ کر آئے تھے قلعے کے صحن میں کھڑے تھے۔ معظم علی ان سے حملے کی تفصیلات پوچھ رہا تھا کہ دروازے کی طرف سے ایک پہریدار بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ دروازے کے باہر ایک آدمی کھڑا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہماری چوکی پر بھی مرہٹوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

معظم علی نے تین سو سواروں کو فوراً تیار ہونے کا حکم دیا اور پھر پہریدار کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "اگر تم اسے پہچانتے ہو تو اسے اندر آنے دو۔"

"جی میں اسے پہچانتا ہوں۔" پہریدار یہ کہہ کر اسی طرح بھاگتا ہوا واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک آدمی لنگڑاتا ہوا قلعے کے صحن میں داخل ہوا۔

معظم علی نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا۔ "تم زخمی ہو؟"

"جی میں قلعے سے ایک میل دور گھوڑے سے گر پڑا تھا۔"

"تم کس چوکی سے آئے ہو؟" معظم علی نے سوال کیا۔

"جی میں شمال کی تیسری چوکی سے آیا ہوں۔ مرہٹوں نے ہم پر بے خبری کی حالت

میں حملہ کر کے ہمارے بیشتر آدمی قتل کر دیئے۔ میرے باقی ساتھی اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے مجھے گھوڑے پر سوار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔"

معظم علی نے ایک عمر رسیدہ افسر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "عبدالرحمٰن! معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں نے بڑے پیمانے پر پیشقدمی شروع کر دی ہے۔ مجھے شاید اس مہم میں چند دن لگ جائیں۔ میری غیر حاضری میں قلعے کی حفاظت تمہارے ذمہ ہو گی۔ تم اسی وقت تمام چوکیوں کے سپاہیوں کو یہ حکم بھیج دو کہ وہ قلعے میں جمع ہو جائیں۔ اگر مرہٹوں کی تعداد زیادہ ہوئی تو میں بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔ ہمیں باہر سے کسی فوری کمک کی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ اگر مرہٹے آگے بڑھ آئے تو یہ قلعہ ہمارا آخری سہارا ہو گا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی تین سو سواروں کے ہمراہ قلعے سے باہر نکل گیا۔

سرحدی علاقوں پر حملہ کرنے والے مرہٹوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہ تھی، وہ اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے سرحدی علاقے کی محافظ فوج کی دفاعی طاقت کا اندازہ کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ علی الصباح قلعے سے چند میل دور مرہٹوں کے چند دستوں کے ساتھ معظم علی کے سپاہیوں کی جھڑپ ہوئی اور وہ معمولی مقابلہ کے بعد پندرہ بیس لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس کے بعد اسے چند میل دور مرہٹوں کے ایک اور دستے کی اطلاع ملی اور اس نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال کر انھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

مرہٹوں کے اچانک حملے سے خوفزدہ ہو کر سرحد کے لوگ اپنی بستیاں خالی کر رہے تھے لیکن معظم علی کی طرف سے بروقت جوابی کارروائی کے باعث ان کے حوصلے بندھ گئے اور وہ دوبارہ اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

ایک شام کوئی پچاس مرہٹے ایک بستی کو لوٹنے میں مصروف تھے۔ معظم علی خبر ملتے ہی وہاں پہنچا اور اس نے تیس آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ اس کے پہنچنے سے پیشتر مرہٹے بستی کے چودھری کے پانچ بیٹوں کے علاوہ دس اور آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے، جن کا

جرم صرف یہ تھا کہ وہ مرہٹوں کے ہاتھوں چند لڑکیوں کی بے حرمتی خاموشی سے برداشت نہ کر سکے۔

معظم علی نے رات بھر اس بستی میں قیام کیا۔ صبح ہوئی تو اس نے آس پاس کی بستیوں کے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "چوروں اور ڈاکوؤں کے سامنے بھیڑوں کی طرح بھاگنے والوں کو بچانا کسی فوج کا کام نہیں۔ فوج کی مدد صرف ان لوگوں کے لیے سودمند ہو سکتی ہے جو بہادروں کی طرح جینا اور مرنا جانتے ہیں۔ اس لیے میں تمھیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم ان چوروں اور ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے اپنی بستیوں میں رضاکاروں کی فوج تیار کرو۔" پھر وہ قیدیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم جیسے خونخوار درندوں کے ساتھ جنگی قیدیوں کا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ میں تمھیں ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہوں جن کے جوان بیٹوں اور بھائیوں کی روحیں انتقام کے لیے پکار رہی ہیں اور میں ان سب سے یہ کہوں گا کہ وہ تمھیں کسی انسانی سلوک کا مستحق نہ سمجھیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمھارے دوسرے ساتھی اس طرف آئیں تو انھیں اس بستی کے باہر ہر درخت کے ساتھ تمھاری لاشیں لٹکتی نظر آئیں۔"

ایک گھنٹہ بعد جب معظم علی اس بستی سے رخصت ہوا تو مقامی لوگ گاؤں سے باہر تیس مرہٹوں کے گلوں میں پھندے ڈال کر درختوں سے لٹکا چکے تھے۔

چند دن تک مختلف مقامات پر درختوں سے لٹکی ہوئی لاشیں اس بات کا ثبوت دیتی رہیں کہ سرحد کا محافظ ان علاقوں سے گزرا ہے۔

قریباً بیس دن کے اندر سرحدی علاقوں میں مکمل امن قائم کرنے کے بعد معظم علی واپس پہنچا اور اس نے قلعے میں داخل ہوتے ہی اپنے نائب مقام سے سوال کیا۔ "مرشد آباد یا میدناپور سے کوئی اطلاع آئی ہے؟"

"جی نہیں!" قائم مقام نے جواب دیا۔

دو دن بعد میدناپور سے ایک فوجی افسر، جس کا نام ہاشم خاں تھا، تیس سواروں کے ہمراہ معظم علی کے پاس پہنچا اور اس نے میدناپور کے فوجدار کا خط پیش کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

"تم خط ملتے ہی قلعے کی کمان ہاشم خان کے حوالے کر کے میدناپور پہنچ جاؤ۔ میں چند اہم معاملات کے متعلق تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں!"

معظم علی نے خط پڑھنے کے بعد ہاشم خاں سے سوال کیا۔ "مرشد آباد سے جنگ کے متعلق کوئی اطلاع ملی ہے؟"

ہاشم خاں نے جواب دیا۔ "جنگ کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ لیکن مرشد آباد سے ایک خاص ایلچی میدناپور کے فوجدار کے پاس آیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لایا ہے لیکن اس کی آمد کے تھوڑی دیر بعد فوجدار نے مجھے اس طرف روانہ کر دیا اور میں یہ معلوم نہ کر سکا کہ ایلچی کیا خبر لایا تھا۔ فوجدار نے اس بات کی سخت تاکید کی تھی کہ آپ فوراً میدناپور پہنچ جائیں!"

معظم علی نے کہا۔ "اگر وہ تاکید نہ کرتے تو بھی میری طرف سے تاخیر نہ ہوتی۔ میں وہاں پہنچ کر مرشد آباد کے حالات معلوم کرنے کے لیے سخت بے چین ہوں۔"

قریباً آدھ گھنٹہ بعد معظم علی اپنے افسروں اور سپاہیوں کو خدا حافظ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ چار نوجوان اس کے ساتھ تھے۔ وہ قلعے سے صرف چار کوس دور گیا تھا کہ اسے ایک سرپٹ سوار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ جب ان کے درمیان کوئی دو سو گز کا فاصلہ رہ گیا تو معظم علی کے ایک ساتھی نے کہا۔ "جناب وہ عبداللہ خاں معلوم ہوتا ہے۔"

معظم علی نے تھوڑی دور آگے جا کر گھوڑا روکا اور آنے والے سوار کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ عبداللہ خاں نے قریب آ کر کسی تمہید کے بغیر سوال کیا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں میدناپور جا رہا ہوں۔" معظم علی نے جواب دیا۔ "تم گھر کے حالات سناؤ!"

عبداللہ خاں، معظم علی کی فوج کے پچاس سواروں کا سالار تھا۔ مرشد آباد میں اس کا

گھر بھی معظم علی کے پڑوس میں تھا۔ قریباً تین ماہ سے وہ رخصت پر تھا۔ وہ جواب دینے کی بجائے گھوڑے سے اتر پڑا اور گردن جھکا کر معظم علی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے عبداللہ؟" معظم علی نے سوال کیا۔

عبداللہ خاں نے گردن اوپر اٹھائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

"کیا ہوا عبداللہ؟" معظم علی نے مضطرب ہو کر دوبارہ سوال کیا۔

عبداللہ خاں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: "میں بہت بُری خبر لایا ہوں آپ میدنا پور کی بجائے سیدھے گھر جائیں۔ مرشد آباد لٹ چکا ہے!"

معظم علی گھوڑے سے کود پڑا اور عبداللہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے چلایا۔ "خدا کے لیے مجھے جلدی بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

عبداللہ خاں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کرتے ہوئے کہا: "آپ کے اباجان اور یوسف شہید ہو چکے ہیں۔ افضل بھی شہید ہو چکا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو تمام واقعات کی اطلاع مل چکی ہو گی۔ ہم جنگ ہار چکے ہیں۔ میر جعفر نے بنگال کو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔"

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ اپنے باپ، اپنے بھائی اور افضل کی موت کا یقین کر سکتا تھا۔ لیکن بنگال کی افواج کی شکست اس کے لیے ناقابل یقین تھی۔ اس نے کرب انگیز آواز میں سوال کیا: "سراج الدولہ کہاں ہیں؟ ہمیں شکست کیسے ہوئی؟"

"سراج الدولہ کے متعلق میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ شکست کے بعد مرشد آباد آ گئے تھے اور پھر راتوں رات وہاں سے نکل گئے تھے۔"

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں انگریزوں کے ہاتھوں سراج الدولہ کی شکست پر کبھی یقین نہیں کر سکتا۔"

"ہمیں انگریزوں نے شکست نہیں دی۔ ہم اپنے غداروں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ میر جعفر انگریزوں سے بنگال کی آزادی کا سودا کر چکا ہے۔ میر مدن شہید ہو چکے ہیں۔ میر جعفر نے فوج کے افسروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ جس وقت ہماری فتح بالکل قریب تھی وہ انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔ میں جنگ میں شریک تھا اور غداری اور وطن فروشی کا منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہمارا توپخانہ خاموش تھا۔ ہمارے بیشتر سوار میدان سے دور کھڑے تھے۔ سراج الدولہ کے مٹھی بھر جاں نثار سینوں پر گولیاں کھا کھا کر گر رہے تھے اور ہم آخری وقت تک یہ سمجھتے تھے کہ ہماری توپیں اچانک آگ برسائیں گی۔ ہمارے سوار اچانک فیصلہ کن حملہ کریں گے اور آن کی آن میں دشمن کو کچل کر رکھ دیا جائے گا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ ہم پلاسی کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے جنگ ہار چکے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے یوسف اور افضل کو گر کر دم توڑتے دیکھا تھا اور آپ کے اباجان جب زخموں سے چُور ہو کر مرشد آباد پہنچے تھے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ سراج الدولہ انھیں محل میں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پھر رات کے وقت جب وہ مرشد آباد چھوڑ رہے تھے تو آپ کے اباجان کو گھر پہنچا دیا گیا تھا۔ آدھی رات کے وقت انھوں نے دم توڑ دیا تو محلے کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کو اطلاع دوں۔"

معظم علی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا: "اب ہمیں میدنا پور جانے کی ضرورت نہیں۔ تم واپس قلعے میں چلے جاؤ۔ میری منزل مرشد آباد ہے۔ عبداللہ تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں آپ کے ساتھ ہوں!" اس نے جواب دیا۔

مرشد آباد کی طرف چند منازل طے کرنے کے بعد معظم علی نے یہ خبر سنی کہ سراج الدولہ قتل ہو چکا ہے۔ میر جعفر نے لارڈ کلائیو کی سرپرستی میں بنگال کی حکومت سنبھال لی ہے اور مرشد آباد میں سراج الدولہ کے وفادار ساتھیوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔